فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۰۴

از جولائی ۱۹۶۹ء تا دسمبر ۱۹۶۹ء

(بترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۱۰۴

از جولائی ۱۹۶۹ء تا دسمبر ۱۹۶۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۴ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۹ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ابھی تک لکھنؤ کے شیعہ سنی اختلاف کا کوئی حل نہیں نکلا ہے، لیکن دونوں کے سنجیدہ طبقہ میں اسکی کوشش جاری ہے، اسلیے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا، ہم نے گذشتہ مہینہ اجمالاً اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا تھا، اس مہینہ کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، شیعہ سنی اختلاف کے نقصانات اسقدر کھلے ہوئے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے مسلمان جن نازک حالات میں گھرے ہوئے ہیں، اُن میں اس اختلاف پر اور بھی حیرت ہوتی ہے، اس سے دونوں فرقوں کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے قطع نظر، اس سے ہمیشہ مسلمانوں کے دشمنوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جس سے مسلمانوں کو من حیث القوم بڑا نقصان پہنچا ہے، اسوقت ہندوستان میں یہی صورتِ حال ہے، چنانچہ فرقہ پرور جماعتیں اس اختلاف کو بھڑکا کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں، ان کا افسوں سنیوں پر تو چل نہیں سکتا، اسلیے انکی کوشش ہے کہ وہ شیعوں سے ظاہری ہمدردی کرکے ان کو سنیوں سے الگ کر دیں، اس ہمدردی میں انھوں نے سنیوں کے بزرگوں پر تبرا بازی بھی شروع کر دی ہے، اور یہاں تک انکا دعوی ہے کہ شیعہ اپنے کو مسلمان نہیں صرف شیعہ کہتے ہیں، یعنی وہ اپنے کو مسلمانوں میں شامل نہیں کرتے جس کو کوئی شیعہ گوارا نہیں کر سکتا، انکی ہمدردی صرف فریب ہے جس جماعت کا مقصد ہی اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا ہو وہ شیعوں کا وجود کب گوارا کر سکتی ہے، اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کی زد سب سے زیادہ شیعوں ہی پر پڑتی ہے، مگر یہ اطمینان ہے کہ شیعوں کا سمجھدار طبقہ اس فریب کو پوری طرح سمجھتا ہے،

اس سے انکار نہیں کہ شیعہ سنیوں کے عقائد میں بعض بنیادی اختلافات ہیں، اسکے باوجود اختلافات کے مقابلہ میں وحدت کے پہلو زیادہ ہیں، دونوں توحید و رسالت کے قائل ہیں، ان کا رسول ایک، کتاب ایک، قبلہ ایک،

عبادات میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ یا خمس دونوں کے یہاں ارکان اسلام ہیں، معاملات کے بہت سے مسائل یکساں ہیں، دونوں کی تہذیب بھی ایک ہے، وحدت کے اتنے پہلوؤں کے ہوتے ہوئے آپس میں ایسا اختلاف جو عناد اور دشمنی تک پہنچ جائے کسقدر [illegible]

اگرچہ شیعہ سنیوں میں ہر دور میں اختلاف رہا، ان میں لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن اسی کے ساتھ بہت سے معاملات میں اشتراک و تعاون بھی رہا ہے، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ کا کوئی صفحہ انکے مشترک کاموں سے خالی نہیں ہے، سنی مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت مغل امپائر کو بنانے اور اسکو مستحکم کرنے میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے، اسکے بڑے بڑے وزراء و امراء اور اراکین سلطنت زیادہ تر شیعہ تھے، خود اورنگزیب جیسے کٹر سنی بادشاہ کی ماں اور ایک بیوی شیعہ تھی، اس دور کی سب سے بڑی اسلامی حکومت پاکستان کے بانی محمد علی جناح شیعہ تھے اور آج بھی اسکا صدر شیعہ ہے، اس سے پہلے سکندر مرزا بھی شیعہ تھے، ہندوستان میں جس کو اسلامی تمدن کہا جاتا ہے تمام تر ایرانی ہے، اور اسکو فروغ دینے والے شیعہ ہیں، اکبری دور سے ہندو رانیوں کے ذریعہ شاہی محلات میں ہندو تمدن کے جو اثرات پہنچ گئے تھے، انکو نور جہاں نے مٹایا جو شیعہ تھی، اردو زبان کو تراش خراش کر ادبی زبان بنانے میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے، اسکے بڑے بڑے شاعر اکثر شیعہ تھے، اور شیعوں کے دوست نما دشمن فرقہ پرور جماعتیں ان سب کو مٹانا چاہتی ہیں، اسلیے اسکی زد سب سے زیادہ شیعوں ہی کے آثار پر پڑتی ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ شیعہ سنی ہمیشہ حریف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی رہے ہیں، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی تاریخ بنانے میں دونوں کا حصہ ہے، اس زمانہ میں بھی مسلم یونیورسٹی دونوں کی مشترکہ کوشش کی یادگار ہے، مغلوں کے دور عروج تک مذہب کے دائرے سے باہر شیعہ سنی کا کوئی سوال نہیں تھا، یہ سارے جھگڑے زوال اور طوائف الملوکی کے دور کی پیداوار ہیں، جب انکے سامنے کوئی مشترک تعمیری کام نہیں رہ گیا تھا اور ہر امیر اپنے اقتدار کی فکر میں تھا، اس لیے یہ مذہب سے زیادہ اقتدار کی جنگ تھی،

شیعہ سنی اگر سمجھداری سے کام لیں تو اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے آج بھی متحد ہو سکتے ہیں، اس وقت اختلافی مسائل دو ہیں، ایک تبرا دوسرا مدح صحابہ، ان دونوں کے دو پہلو ہیں، اگر تبرا شیعوں کا جزو ایمان ہے، تو اس سے ان کو کوئی نہیں روک سکتا، وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہیں، اور اپنے گھروں اور اپنی مجلسوں میں جس طرح چاہیں اس پر عمل کریں،

لیکن کوئی قانون و اخلاق اسکی اجازت نہیں دے سکتا کہ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں اور سنیوں کے پیشواؤں کو جن کو خود قرآن نے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند دی ہے، اور جن کی عظمت کے غیر مسلم تک معترف ہیں، علانیہ اور برسر عام برا بھلا کہا جائے، جو شیعہ مورخین انکی دینی حیثیت کے قائل نہیں ہیں وہ بھی ان کے اسلامی خدمات اور کارناموں کے ذکر پر مجبور رہیں، اس لیے کہ تاریخ سے ان کو نہیں مٹایا جا سکتا، ایسی محترم ہستیوں پر دشنام طرازی تو انسانی شرافت کے خلاف ہے، اس لیے بہت سے شیعہ مفکر اور اہل علم سرے سے تبرا کے خلاف ہیں، قرآن نے تو غیر مسلموں کے معبودان باطل کو بھی برا کہنے کی ممانعت کی ہے، اور برسر عام تبرا حضرت علیؓ کی سنت نہیں، بلکہ امیر معاویہؓ کی بدعت ہے، جس کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بند کیا تھا،

مدح صحابہ کے بھی دو پہلو ہیں، ایک صحابۂ کرام کے فضائل و مناقب، ان کے اسوۂ حسنہ اور انکے اسلامی خدمات کا بیان تو یہ کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض نہیں، یہ تو دنیا کے لیے سبق آموز ہیں، اور ان کے بغیر اسلام کی تاریخ ناقص رہتی ہے، اس لیے اگر سنی اپنی مجلسوں اور مذہبی اجتماع میں ان کو بیان کرتے ہیں تو اس سے شیعوں کی کیا دل آزاری ہوتی ہے، اس کا دوسرا پہلو مدح صحابہ کے جلسے اور جلوس ہیں یعنی محرم کے جلوس کی طرح مدح صحابہ کا جلوس نکالا جائے اور اس میں مدح صحابہ کے اشعار پڑھے جائیں تو اہل سنت کے عقیدہ کی رو سے بھی بدعت ہے اور اگر شیعوں کی ضد میں ایسا کیا جائے تو اور بھی برا ہے اسلیے سنیوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے،

شیعہ سنی اختلاف کی یہ شکل کسی اسلامی ملک میں نہیں ہے، نہ شیعہ ملک ایران میں تبرا کی یہ شکل ہے اور نہ سنی ملکوں میں مدح صحابہ کی، وہاں ان مسائل کا وجود ہی نہیں ہے، یہ فخر صرف ہندوستان کے شیعہ سنیوں کو حاصل ہے کہ ان حالات میں بھی جب یہاں کے مسلمان ہر طرح کے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، وہ ان خرافات میں مبتلا ہیں، جس کا نتیجہ دونوں کو بھگتنا پڑے گا، امید ہے کہ ان سطور کی اشاعت کے وقت مفاہمت کی کوئی شکل نکل چکی ہوگی۔

مقالات

عبد القادر نورس اور اس کا کلام

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۲)

دیوان اور شاعری دیوان نورس کا نادر نسخہ مدراس کے مشرقی مخطوطات کے سرکاری کتابخانے میں زیر شمارہ ف ۵۹ محفوظ ہے، اس میں ۱۰۶ صفحے اور ہر صفحے میں ۹ سطریں ہیں، خط نستعلیق ہے اور یہ جدید خط سو سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا، مرتب فہرست (ج ا ص ۲۰۱ - ۲۰۲) بعض امور کے متعلق غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں، مثلاً

۱۔ نورس کو غیر مشہور ([illegible]) شاعر قرار دیا ہے، حالانکہ اس کو اتنی شہرت حاصل نہ تھی،

۲۔ دیوان کو خط قدیم بتایا ہے، جو حقیقت سے دور ہے،

۳۔ یہ خیال کہ نورس نے اپنی ماں کا مرثیہ لکھا تھا اور اس میں اپنے ممدوح محمد علی سے مدد طلب کی تھی سراسر غلط ہے، ماں کے مرثیہ میں کسی ممدوح کا ذکر نہیں، البتہ سلطان محمد عادلشاہ اور سلطان علی عادلشاہ کے لیے الگ مقطعات لکھے ہیں، اور ان دونوں مخدوموں کا نام ملا کر کے ایک فرضی نام محمد علی بنا لیا ہے جس سے امداد طلب کرنے کی روایت فرض کر لی ہے۔

۴- اس کو نثر نویس بھی قرار دیا گیا ہے، مگر زیر نظر دیوان میں کوئی نثری نمونہ شامل نہیں، اس لیے یہ بیان یقیناً کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے،

نورس کا دیوان حسب ذیل اجزا پر مشتمل ہے:

(الف) غزلیات بترتیب حروف تہجی   ورق ۱ب — ۷۸آ

(ب) مقطعات   ورق ۷۸آ — ۸۸آ

(ب) رباعیات   ورق ۸۸ب — ۹۲ب

(ج) مثنوی ساقی نامہ   ورق ۹۲ب — ۹۴ب

دیوان بہت اچھی حالت میں ہے اور بحالت موجودہ مکمل ہے، اوراق بھی بے ترتیب نہیں،

اگرچہ نورس ایک قادر الکلام شاعر تھا مگر اس کو درجۂ اول کا شاعر نہیں قرار دیا جا سکتا، اس نے غزلیں زیادہ لکھی ہیں مگر ان میں بھی وہ سوز و گداز نہیں جو شاعری کی جان ہے، قادر الکلامی کے باوجود اس کے اشعار ضرب المثل نہیں ہو سکے، اسی طرح اس کے تراشے ہوئے فقرے بھی کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں، اور حسن تمثیل اور حسن بیان اس کی شاعری کی عمومی خصوصیت نہیں ہے، مگر اس کے بعض اشعار بڑے دلکش ہیں جنھیں اچھی شاعری کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ باوجود کم گو ہونے کے (یہ قیاس مختصر دیوان کی بنا پر ہے) کلام یک رنگ نہیں، بعض اشعار بہت پست اور بعض بہت بلند ہیں، اس کی غزلوں کی حسب ذیل خصوصیات قابل ذکر ہیں:

۱- عام شاعروں کی طرح نورس نے بھی اپنے پیشرو شعرا میں سعدی اور کمال خجندی کا ذکر کیا ہے:

بندۂ آں سعدی و قتم چو عیشی کز دمش   لفظ و معنی در سواد جامہ بوی گل گرفت[1]

بخاطرم ز خیالات نورسی گذرد   کہ رشک شعر کمال خجند خواہد شد[2]

۱؎ دیوان ورق ۱۵ آ ۲؎ ورق ۴۴ ب اس بیت میں صائب کا ذکر کرتا ہے۔

برد شعر نورس بصائب رساں - گر او غیرت از شعر سنجر برد (ورق ۳۲ ب)

معلوم نہیں کہ اس میں میر سنجر کاشی کی طرف اشارہ ہے یا کسی اور کی طرف۔

معلوم نہیں کمال خجندی کی شاعری سے واقعی متاثر تھا یا محض قافیہ کی مجبوری سے اس کا ذکر کیا ہے،

۲- بعض شاعروں کی تقلید اس طرح کی ہے کہ ان کی مشہور غزلوں کے جواب میں غزلیں لکھی ہیں مثلاً حسب ذیل غزل حافظ کی مشہور غزل

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود   وایں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

کے جواب میں واقع ہوئی ہے[1] اور اس غزل کو ایک کامیاب کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔

چوں سر زند سرشک تف نالہ می رود   آری شب از دمیدن بتخالہ می رود

در خوبی رخ تو تفاوت نشد ز خط   کی روشنی مہر و مہ از ہالہ می رود

گویم نخلی چوں لب تو حرف سر زند   آری بتحفہ قند بہ بنگالہ می رود

در میکدہ اگر دل من شاد شد چہ شد   اینجا سخن ز کلفت صد سالہ می رود

چوں تو گلم بناز کند سیر باغ و راغ   از شرم رنگ وردی گل لالہ می رود

زاہد برو برای فریبم مکن تلاش   از جا چنا کلیم ز گوسالہ می رود

چوں می رود بہ بزم سخن طبع نورسی   معنی ز پیش و لفظ ز دنبالہ می رود

۳- بعض غزلوں میں شاعر کی ہمعصر اہم شخصیتوں کا ذکر ہے، مثلاً سپہ سالار احمد غازی (ورق ، عیشی (ورق ۱۵ آ)، ابراہیم عادلشاہ (مسمی خلیل) ورق ۱۸، صائب و سنجر (ورق ۳۲ ب) شہنشاہ دکن (ورق ۳۵ ب) حسن محمد خاندیسی (۴۴ آ)، شاہ نورس ابراہیم (۴۵ آ)، شہ عادل لقب (۴۲ ب)

۴- بعض غزلیں روانی حسن تشبیہ اور تخئیل کی اچھی مثالیں ہیں، اسکے نمونے حسب ذیل ہیں،[2]

بہار آمد و بلبل چمن بنالہ گرفت   خوش آں کسی کہ درین ذوق خوش پیالہ گرفت

سیاہ حسن تو بر روشناں شبخوں زد   ازاں سبب مہ روشن حصار ہالہ گرفت

۱؎ ورق ۳۵ ب ۲؎ ورق ۱۲ الف

زود رفت بصد حیلہ شد گرہ در حلق زخوان چرخ خنک ہر کہ یک نوالہ گرفت

خراب کردۂ آں چشم فتنہ انگیزم کہ طرز گردش او نکتہ بر غزالہ گرفت

پی نظارۂ گل در چمن مرو شیریں کہ اشک دیدۂ فرہاد رنگ لالہ گرفت

ز دو عزیز چگونہ شود ذلیل فلک کہ در ازل ز خطہ سکہ اش تبالہ گرفت

ز نورسی سخنداں دگر چہ می طلبی کہ یکہ و بیت ترانہ ز صد رسالہ گرفت

جانِ من از من بریدی عہد الفت را چہ شد[1] طرح یکرنگی و آغاز محبت را چہ شد

بیش ازیں ہر ساعتم صد لطف میکردی کنوں مہربانی را چہ پیش آمد مروت را چہ شد

ہیچکس گرم تعصب نیست در ایام ما اختلاف کیش حنفا دو دولت را چہ شد

سر نزد در گلشن از بلبل دمادم صد غزل گل ہمابردی لبی خند فصاحت را چہ شد

کام دل اینجا بصد منت نمی افتد بدست ہاں بر و بگمند با غم سازہمت را چہ شد

غیر خرسند است اگر می ہر شش نورسی زود ترکن فکر کار خویش غیرت را چہ شد

نورس کے قطعات بڑی اہمیت رکھتے ہیں، شاہان دکن کے ذیل میں بعض قطعات کا ذکر آچکا ہے،

پہلے ان قطعات کا ذکر کیا جاتا ہے، جن سے کچھ تاریخی مواد فراہم ہوتا ہے، مثلاً

۱۔ خواص خاں ایک نالائق حاکم تھا،[2]

۲۔ ۱۰۴۶ھ[3] میں محمد عادل شاہ کے وزیر کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، وزیر کی خوبیوں کے ساتھ لڑکے کی پیدائش کی تاریخ "مہر سپہر سعادت" (۱۰۴۶ھ) نکالی گئی ہے،

۳۔ اسی سال ایک ممدوح کے دو بچے فوت ہوئے، اس پر اس نے حسب ذیل قطعہ لکھا:[4]

صاحبا از دو جگر گوشۂ توصیف کر نیست خلد را چوں رخ ایشان بحدیقہ وردی

سال شاں گر بتسل از تو بپرسند بگو آہ دردی دگرم داد فلک بر دردی

---

[1] ورق ۲۲۴ ب [2] ورق ۶۸ ب [3] ورق ۲۸۵ [4] ورق ۸۵ ب

۴۔ فتح خاں غالباً علی عادل شاہ کے دور کا امیر تھا، اور بڑا بادہ نوش تھا، ۱۰۶۹ھ میں اس نے شراب سے توبہ کی، نورس نے "فتح خاں" "گذاشتہ مل" سے اسکی تاریخ نکالی ہے،[1]

۵۔ محمد عادل شاہ کی وفات کا سال ایک قطعہ میں درج کیا ہے،[2]

اس میں ضمناً ذکر ہے کہ اس نے ماں کے مرثیے میں[3] جو قطعہ لکھا ہے وہ بڑا پُر تاثیر اور دلکش ہے،

نورسی کے وہ قطعات جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں سے بعض کی تفصیل پیش کیجاتی ہے،

۱۔ ایک قطعۂ تاریخ[4] خواص خاں کے قتل پر لکھا ہے، اس میں "در یکان سر ش برید" سے قتل کی تاریخ ۱۰۴۵ھ نکلتی ہے،

خواص خاں جو محمد عادل شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی مصطفیٰ خاں کے ساتھ ناظم مہمات مملکت مقرر ہوا تھا، نہایت بد سرشت حاکم تھا، اس کا نام دولت یار تھا، یہ اور اس کا بھائی مبارک یار دونوں بادشاہ کے ایک منہی شاگرد چاند خاں کے غلام تھے، یہ دونوں اصلاً ہندو تھے، چاند خاں نے دونوں کو بادشاہ کے حوالے کر دیا، بادشاہ نے ۱۰۴۳ھ میں دولت یار کو دولت خاں کا خطاب دیکر بیجاپور کا حوالہ دار مقرر کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کی خفیف الحرکاتی سے ناخوش ہو کر قید کر دیا، مگر پھر مرزا امین کی سفارش پر جو بعد میں محمد عادل شاہ کے دور میں مصطفیٰ خاں کے لقب سے ملقب ہوا، اس کے عہدہ پر دوبارہ بحال کر دیا اور مرزا امین سے کسی معاملے میں انحراف نہ کرنے کی تاکید کی، محمد عادل شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر اس نے اپنے محسن محمد امین کے دوش بدوش اپنے اخلاص و وفاداری کا ثبوت دیا، اس کے نتیجے میں محمد امین مصطفیٰ خاں اور دولت خاں خواص خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، اور دونوں کو امور مہمات مملکت کا ناظم مقرر کیا گیا،[5] لیکن خواص خاں کی طبیعت میں دنائت تھی جس کا اظہار تھوڑے ہی دنوں میں ہونے لگا،

---

[1] ورق ۸۶ ب، اس قطعہ میں "بجرکش" کا فقرہ دلچسپ ہے، [2] ایضاً [3] ورق ۱۸۱ ب - ۱۸۳ [4] دیوان ورق ۱۸۴ [5] یہ تفصیلات بساتین السلاطین ص ۲۸۲، ۲۸۴ سے ماخوذ ہیں،

اور وہ اپنے عزیزوں اور اپنے قدیم ہم مذہبوں کی بیجا طرفداری کرنے لگا، محمد ظہور نے محمد نامے[1] میں اس پر یہ قطعہ لکھا ہے جس کا پہلا شعر حسب حال ہے

سفلہ را جا بودی صدر مدہ　　　تا نگیرد ہمہ را خوف و خطر

رفتہ رفتہ اس نے اپنا اقتدار اتنا بڑھا لیا کہ مصطفےٰ خاں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا، اور اب اس کے عجب و غرور کی کوئی حد نہ رہ گئی، سپہ سالاری کا منصب مراری نام ایک برہمن کے سپرد کیا اور سارے نظم و نسق پر پوری طرح مسلط ہو گیا، اس کا ایک بھائی حسین خاں تھا، اس کو قلعہ دار مقرر کیا، اس کا فسق و فجور اور خلق آزاری ضرب المثل بن گئی، ظہور کہتا ہے:

نامش حسین خاں بغلط　　　کرشیدی بنام نیکال خط

نوبت یہاں تک پہنچی کہ مراری پنڈت کے اغوا سے مصطفےٰ خاں سے برسرپیکار ہو گیا اور خاں مذکور کو مع اس کے رفقا اسد خاں، مرزا نور الدین وغیرہ کے قید کر لیا، مگر اس طرح دوسرے معتمدان بارگاہ کو برطرف کر دینا آسان کام تھا، اس لیے جب اس کی شقاوت اور مردم آزاری حد سے بڑھ گئی تو امرانے رستم زماں سے ملکر اس کے برطرف کرنے کی سازش کی اس درمیان میں بادشاہ کو خبر لگی کہ خواص خاں مغل بادشاہ، شاہ جہاں سے خفیہ طور پر سازش کر رہا ہے، اس خبر سے محمد عادل شاہ کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی، اس نے اخلاص خاں کو جو اس وقت سیدی ریحان رفتہ رساں کے نام سے مشہور تھا، اس کام پر مامور کیا، اس نے کریم شرزہ اور حسین خاں سے مشورہ کیا، دونوں خواص خاں کے قتل پر تیار ہو گئے، اور ایک روز جب خواص خاں شاہی دربار سے نکل رہا تھا، موقع پاکر کریم شرزہ نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا، اور حسین خاں نے آگے بڑھ کر دوسرا وار کر کے کام تمام کر دیا، اسکے

[1] نسخہ کتابخانۂ دانشگاہ اسلامی علی گڑھ ورق ۱۳۶

بعد ہی مبارک خاں بھی قتل ہوا، اور دونوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیے گئے، اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد مراری بھی جو خواص خاں کا پروردہ اور سپہ سالاری کے معزز عہدے پر متمکن تھا، اپنے کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا، تاریخ محمدی کا مولف ظہور بن ظہوری لکھتا ہے کہ خواص خاں کا قتل ایسا مبارک ثابت ہوا کہ لوگوں نے قحط کی مصیبت سے نجات پائی، عرصے سے بارش نہیں ہوئی تھی، اس کے بعد بارش خوب ہوئی اور لوگوں کی امیدیں[1] بر آئیں،

محمد نامے کے نسخۂ علی گڑھ میں خواص خاں کے زوال اور قتل کا واقعہ ۱۰۳۶ھ[2] میں بتایا گیا ہے، جو سراسر غلط ہے، یہ واقعہ ۱۰۴۵ھ کا ہے، جیسا کہ عبد القادر نورس کے قطعے سے ظاہر ہوتا ہے، بساتین السلاطین میں صحیح تاریخ ۱۰۴۵ھ[3] بتائی گئی ہے، اور نورس شاعر کی تاریخ[4] بھی درج ہے (اگرچہ اس میں شاعر کا نام مذکور نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جب یہ پورا قطعہ اس کے دیوان میں موجود ہے تو پھر اسے کسی اور کی ملک قرار نہیں دیا جا سکتا، وہ قطعہ یہ[5] ہے،

آں بیش بد قیا فہ زمانہ کہ ردی او　　　اہل زمانہ دیدہ لبس آزردہ دل شدہ

بیش دلیس پر بندہ قبل کردہ مدتی　　　چوں نادرش بدست لبی منفعل شدہ

از شرم لاف مردی و مردانگی خود　　　چنداں گریستہ کہ سراپا بگل شدہ

برخاست چوں خجل شدہ از پای اں حصار　　　تاریخ شد چنیں کہ زمانہ خجل شدہ

"زمانہ خجل شدہ" سے ۱۰۴۵ھ تاریخ نکلتی ہے، اس قطعہ میں مغلوں کے حملے کی طرف اشارہ مقصود ہے،

قلعۂ پرندہ پہلے نظام شاہی قلمرو میں تھا، پھر محمد عادلشاہ کی تخت نشینی کے چند ہی سال کے اندر

[1] یہ تفصیلات محمد نامہ نسخۂ کتابخانۂ دانشگاہ اسلامی علی گڑھ ورق ۱۳۶ الف - ۱۴۲ ب سے ماخوذ ہیں [2] ورق ۱۴۱ الف [3] ص ۳۴۵ - ۳۴۶ [4] ص ۳۱۲؛ [5] دیوان ورق ۸۰ الف

عادلشاہی سلطنت میں شامل ہو گیا، جب نظام شاہی سلطنت میں ابتری پھیلی تو وہاں کے حاکم آقا رضوان نے یہ قلعہ عادلشاہی امرا کے سپرد کر دیا[1] اور ۱۰۴۲ھ میں وہاں سے شہرۂ آفاق توپ ملک میدان سپہ سالار مرادی برہمن کے واسطے سے بیجاپور لائی گئی[2]، ۱۰۴۵ھ میں مغل سپہ سالار مہابت خاں نے شاہزادہ دارا شکوہ کی سرکردگی میں اس قلعے کا محاصرہ کیا، اس کی فوج چار ماہ تک قلعہ کا محاصرہ کیے پڑی رہی، مگر سرنگ لانے میں کامیابی نہ ہو سکی، عادلشاہی امرا جو قلعہ کی حفاظت پر متعین تھے، ان میں رستم زماں، حبش جنگ خاں، فرہاد خاں اور انکس خاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان ہی کی مردانہ مدافعت سے مغل لشکر محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوا[3]، ظہور تاریخ محمدی میں لکھتا ہے[4]:-

"چون دریافتند کہ در پای برج حصار بہ نقب زدن کار از پیش نمی رود، بغایت دل تنگ گرفتہ خاطر گشتند و مہابت خاں از امتداد محاصرہ و جنگ بغایت محزون واندوہگین شدہ ..... بی اختیار قدم در راہ فرار نہاد و شہزادہ دارا شکوہ را بجہت محافظت بجای چتر زرین سپہر آئین بر سر گرفتہ در میان لشکر جای داد و فرمان طلب شاہجہان را بہانہ ساختہ متوجہ ہندوستان شد، و بہادران سپاہ حضرت پادشاہ غازی تمام راہ مغولان را تعاقب نمودہ غارت کنان می رفتند، خان ظفر توام رستم زمان اگر دران زمان پاس امر حضرت پادشاہ غازی نمی داشت از لشکر مخالفان ہیچ گریزندہ را زندہ نمی گذاشت..... مہابت خان بہر منزلی کہ می رسید نقود نامعدود بطریق باج و خراج بہ پیشکش دز را حضرت پادشاہ غازی می نمود و بہمین نہج خود را بہ برہان پور رسانید"

واضح ہے کہ نورس نے اسی محاصرہ کا ذکر اپنے قطعہ میں کیا ہے، اس قیاس کی تائید حسب ذیل امور سے ہوتی ہے:

[1] مزید اطلاع بساتین السلاطین ص [2] ... دیکھئے محمد نامہ ورق ۱۰۰ و بساتین [3] محمد نامہ ورق ۱۱۷ ب [4] ایضاً ورق ۱۱۰ - ۱۱۹ ملخصاً

۱- پرینڈہ کا یہ محاصرہ تاریخوں میں مذکور ہے۔

۲- اگرچہ محمد نامہ اور بساتین السلاطین میں اس واقعہ کی کوئی متعین تاریخ درج نہیں ہے، لیکن دونوں میں اس کو ۱۰۴۲ھ اور ۱۰۴۵ھ کے درمیان بیان کیا گیا ہے (یعنی مرادی کے ۱۰۴۲ھ میں توپ ملک میدان کے لانے کے بعد اور خواص خاں کے واقعے سے پہلے) بساتین[1] میں اس کو مصطفی خاں کے قید ہونے کے قریب کا بتایا گیا ہے، ان ہی ایام میں خواص خاں بھی مقتول ہوا جس کی تاریخ بساتین وغیرہ میں ۱۰۴۵ھ تصریح کے ساتھ ملتی ہے، اس بنا پر پرینڈہ کا محاصرہ بھی ابتدائے ۱۰۴۵ھ کا قرار دیا جا سکتا ہے، اور چونکہ نورس کے قطعے میں یہی تاریخ واضح طور پر درج ہے، اس لیے اس قطعہ کو پرینڈہ کے علاوہ کسی اور محاصرہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

قطعہ میں "حبش بد قیافہ" سے بظاہر مہابت خاں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۳- نورس نے رندولہ کی وفات[2] پر یہ قطعہ نظم کیا تھا:

رندولہ خاں کہ حضرت شاہ　　گفت او را رستم زمانم
چون شدہ ز جہاں، فغان کردم　　از چرخ گذشت چون فغانم
ایں حبش کہ سرنگوں نوید　　تاریخش ..... خامہ بنانم
سرزد ز زبان حضرت شاہ　　"افسوس ز رستم زمانم"

"افسوس ز رستم زمانم" سے ۱۰۵۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رندولہ خاں نے جو "رستم زماں" کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا، اسی سنہ میں وفات پائی، رندولہ خاں عہد محمد شاہی کا نامور سپہ سالار گزرا ہے، اسی کی فوجی قابلیت سے عادلشاہی حکومت کو استحکام اور وسعت حاصل ہوئی، اس کے بارے میں تاریخ محمدی[3] اور بساتین[4] میں بڑی مفید اور کارآمد باتیں ملتی ہیں، اول الذکر

[1] ص [2] دیوان ورق ۱۰۶ الف [3] ورق ۱۵۷ - ۱۵۸ [4] ص

ے معلوم ہوتا ہے کہ کرناٹک اور ملنار کی ابتدائی فتوحات اس کی قابلیت کا نتیجہ تھیں، بکیری[1] کا زمیندار ویربھدر[2] اسی کے ہاتھوں پسپا ہوا، اور اس نے اٹھارہ[18] لاکھ ہون اور اپنی نصف ولایت دے کر صلح کی، چند ہی دنوں بعد پھر قلعہ بکیری پر عادلشاہی افواج کا قبضہ ہوا، گنگ[3] نایک جو بکیری کی فتوحات میں رستم زماں کے ساتھ تھا، جب باغی ہوا تو رستم زماں ہی اس کی سرکوبی پر مامور ہوا، اور اس کو ایسا مجبور کیا کہ چالیس[4] لاکھ ہون دینے پر راضی ہونا پڑا، چکنا کین ہلی[5] پر حملے کے موقع پر رستم زماں افضل خاں سپہ سالار کے ساتھ تھا، اسی طرح قلعہ ٹکور اور بلور کی فتح کے موقع پر افضل خاں اور رستم زماں دونوں عادلشاہی افواج کے سردار اور سرگروہ تھے، بالاپور کی فتح بھی رستم زماں کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی، ان واقعات کی تفصیل اور قلعوں کے ناموں میں تاریخ محمدی اور بساتین السلاطین میں کچھ اختلاف ہے، راقم نے محمد نامہ کے بیان کا خلاصہ دیا ہے، ہمارے پیش نظر نسخے میں اغلاط بہت ہیں، اس بنا پر ہمارے بیان میں بھی غلط مبحث کا امکان ہے، اگرچہ بساتین کے اہم آخذ میں محمد نامہ شامل تھا، لیکن بعض اہم امور میں دونوں میں بظاہر اختلاف پایا جاتا ہے، محمد نامہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رندولہ خاں کا عروج ۱۰۴۵ھ کے بعد ہوا ہے، اور اس کو اس خطاب سے اس تاریخ کے بعد ملقب کیا گیا، چنانچہ ظہور[6] رقمطراز ہے:-

"در ہزار و سی[7] رندولہ خاں ابن فرہاد خاں را کہ یکی از خانہ زادگان درگاہ معلی بود بحضور موفور السرور طلبیدہ خطاب رستم زمانی و خلعت سپہ سالاری مرحمت فرمودند و جہت انتظام ولایات آن حدود (کرناٹک و ملنار) و برای تنبیہ نمودن ویربھدر کہ در قلعہ بکیری بجمعیت خزانہ و کثرت خیل و حشم دم از نافرمانی میزد، نامزد نمودند، رستم زماں با سپاہ ظفر آثار بسرحد ملنار رسید ..... قلعہ بکیری را متصرف گردید قریب یک ماہ در آنجا مقام نمود ..... بر قلعہ کنول درک کہ

[1] بساتین میں آنگیری ہے، [2] معلوم نہیں صحیح قرأت کیا ہوگی [3] نام کی قرأت قطعی نہیں [4] اسکا املا مختلف طرح پر ہے [5] اسکی صحیح قرأت معلوم نہ ہوسکی [6] ورق ۱۵، [7] یہ تاریخ غلط ہے اس تاریخ میں غلط تاریخ کی متعدد مثالیں ملتی ہیں

ویربھدر در آن متحصن بود تاخت نمود ......"

اس تفصیل سے واضح ہے کہ رندولہ خاں کو اسی مہم کے موقع پر رستم زماں خاں کا خطاب ملا تھا، اور چونکہ یہ مہم ۱۰۴۶ھ - ۱۰۴۷ھ میں شروع ہوئی، اس بنا پر اس خطاب کی تاریخ بھی یہی ہوگی، ۱۰۴۵ھ میں خواص خاں مقتول ہوا اور اس کا معتمد علیہ مراری پنڈت بھی ایک ماہ کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اس سے مزید یہ خیال ہوتا ہے کہ مراری کے بعد یہ عہدہ رستم زماں کے سپرد کیا گیا،

رستم زماں نام کا ایک سردار اس مہم سے قبل کی دو بڑی مہموں میں تاریخ محمدی میں نظر آتا ہے، ایک پرندہ کے محاصرہ[1] کے موقع پر، اس مہم میں جو عادلشاہی سردار کی محافظت پر مامور تھے اُن میں رستم زماں سر لشکر تھا، دوسری بار جو امراء خواص خاں کو برطرف کرنے میں پیش پیش تھے ان میں رستم زماں بھی شامل تھا[2]، بساتین میں دونوں جگہ[3] رستم زماں کے بجائے رندولہ خاں تحریر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رستم زماں کا عہدہ اس کو ۱۰۴۵ھ سے قبل مل چکا تھا، مگر تاریخ محمدی کے واضح بیان کی موجودگی میں اس خیال کو صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ یہ معلوم ہے کہ ان واقعات میں بساتین کا اصلی ماخذ یہی آخر الذکر تاریخ ہے، واقعہ یہ ہے کہ رستم زماں کا خطاب اسی زمانہ میں رائج تھا مگر ۱۰۴۵ھ سے قبل جو امیر اس خطاب کا حامل تھا، اسکے نام سے ہم واقف نہیں، ۱۰۴۶ھ کے بعد یہ خطاب رندولہ خاں کو ملا، اور اس کی وفات ۱۰۵۲ھ کے بعد ۱۰۵۴ھ میں شاہزادہ علی کے تقریب[4] جشن ختنہ کے سلسلہ میں رحیم خاں کا ذکر اس خطاب کے ساتھ ہے، علی عادلشاہ ثانی کے دور میں رستم زماں کا خطاب مروج تھا، چنانچہ "تاریخ علی عادلشاہی"[5] میں دوبار[6] رستم زماں وزیر کا ذکر آیا ہے،

مختصر یہ کہ رندولہ خاں ۱۰۴۶ھ - ۱۰۴۷ھ میں رستم زماں کے خطاب سے سرفراز ہوا، لیکن

[1] ورق ۱۱۷ - ۱۱۹ [2] ورق ۱۳۷ - ۱۳۸ [3] ص ۳۰۷ - ۳۰۹ علی الترتیب [4] ورق ۲۱۴ | [5] ایضاً [6] ص ۱۷۹

صاحب بساتین کی غلط فہمی کی بنا پر تاریخ محمدی میں جہاں جہاں رستم زماں آیا، اس کو رندولہ خاں سے بدل دیا ہے۔ اس بنا پر محاصرۂ پینڈہ اور واقعۂ خواص خاں میں جو رستم زماں مذکور ہے اس کو رندولہ سے الگ سمجھنا چاہیے، اس کے باوجود رندولہ خاں کی شخصیت کی اہمیت اور اسکی ذاتی قابلیت کسی ثبوت کی محتاج نہیں، نورس کے قطعے کی اہمیت یہ ہے کہ تاریخ میں رندولہ کی وفات کا ذکر نہیں ہے۔ اس اہم شخصیت کی تاریخ وفات درج کرکے اس کمی کو پورا کیا،

نورس کی رباعیات بھی تاریخی مواد کا کام دیتی ہیں، ایک رباعی شب برات کے چراغاں کے موقع پر لکھی گئی تھی، دکن میں عام طور پر شب برات کا چراغاں بڑی خصوصیت رکھتا تھا، شاہان وقت بھی اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے، اس لیے شعراء کے دواوین میں اس تقریب کی اکثر نظمیں موجود ہیں، نورس کی اس تقریب کی رباعی یہ ہے:

ای بر تو شب برات میموں باد[1]	عمر تو زہر چہ ہست افزوں باد
از فرط چراغ مجلس تو ہر شب	زینت دہ دہر ہمچوں گردوں باد

درج ذیل رباعی کسی "کاکا غیز" سے جنگ کے موقع پر لکھی گئی تھی

از بیم تو گشت زرد کاکا غیز[2]	بپیچید رخ از نبرد کاکا غیز
شاہ ز تو پرسد گر تاریخش گو	رہ بگریز کرد کاکا غیز

نام سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ کوئی پرتگیزی تھا،

بظاہر اس واقعہ کی تاریخ ۱۰۳۹ھ ہوگی جو کاکا غیز کے کاکے اعداد کے نکالنے سے حاصل ہوتی ہے،

دو رباعیوں میں سلطان علی عادل شاہ کی تاریخ جلوس ہے، اور ایک رباعی قدیم ہے جو

۱؎ دیوان ورق ۸۸ب ۲؎ ورق ۱۰۱ب

۱۰۲۳ھ میں حضرت عتیق اللہ کے روضے کی تعمیر کے موقع پر کہی گئی تھی، اس میں "بیت العتیق" سے تاریخ نکلتی ہے،

بعض رباعیاں دلکش ہیں، حسب ذیل رباعی سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا:۔

از رنگ تو ایزد شفق گردوں کرد[1]	مرقوم ز نعت ورق گردوں کرد
تا بر تو فرشتگاں فرستند درود	پر از گل انجم طبق گردوں کرد

آخر میں ۳۴[2] ابیات پر مشتمل ایک ساقی نامہ ہے، لیکن نہ اس کے ممدوح کا پتہ ہے اور نہ تاریخ تصنیف کا، اس میں ساقی و شراب کی تعریف ہے، اور عام ساقی ناموں کی طرح تشبیہات و استعارات کے اچھے نمونے پیش کیے گئے ہیں، چند اشعار درج ذیل ہیں،

من و مدح پیر خرابات من	کہ چوں مہر روشن کند ذات من
بدل صبح و شامش ستائش کنم	بجاں شام صبحش ثنائش کنم
مروت بطبعش چو نشاء بمی	سخاوت بدستش چو نغمہ بنی
حریفاں بصد جاں فدای وینند	شہانِ دو عالم گدای وینند
گدا را بیک جرعۂ جامِ می	دہد پادشاہی کاؤس و کی
کند گاہ دیوانہ فرزانہ را	کند گاہ فرزانہ دیوانہ را
گہ از خندہ چوں جام خنداندم	گہ از گریہ چوں شیشہ گریاندم
ازاں غازہ و وسمۂ مشکبو ہی	کشد چہرہ و مہ را ابرو و روی
شد از اہتمام تمامش شراب	بمعنی چو آتش بصورت چو آب
دمی رنگ و بویش چو ساغر گرفت	گل و لالہ را گرم شد در گرفت

۱؎ ورق ۸۸ب ۲؎ ورق ۹۲ تا ۹۴ب

مگرتاک او را خضر داد آب　　کہ زندہ کند مردہ را از شراب

بدست از سبو چو برارد شراب　　زند پنجہ در پنجۂ آفتاب

شب تیرہ چوں در ایاغ کسی　　فرو افگند می ز شیشہ بسی

حباب آں زماں سرزند از ایاغ　　کند کار صد گوہر شب چراغ

گر از می دمی شعلہ افروز دش　　زمین و زماں را چو خس سوز دش

سخن کوتہ او پیر پیراں بود　　غلط گفتم از بی نظیراں بود

از و شد برونق چنیں میکدہ　　کہ گویم بہشت بریں میکدہ

فاتح ہند محمد بن قاسم ثقفیؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

۹۶ھ میں محمد بن قاسم کی موت اور اس کی نوعیت

اموی دور خلافت کا درمیانی حصہ اس اعتبار سے بڑا شاندار تھا کہ اس میں بہت سے ممالک فتح ہوئے اور حدود خلافت میں بڑی وسعت پیدا ہوئی، امام ذہبیؒ نے لکھا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا زمانہ (۸۶ھ - ۹۶ھ) بہت ہی برکت وسعادت کا زمانہ تھا، اس کے دور میں ہندوستان، ترک اور اندلس کی فتوحات ہوئیں اور ۹۳ھ میں خاص طور سے ارض مغرب، اندلس، روم اور سرزمین ہند کے ملک فتح ہوئے، بلکہ ۹۰ھ کے بعد مشرق و مغرب میں جس قدر فتوحات ہوئیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے بعد اس قدر فتوحات کسی زمانہ میں نہیں ہوئی تھیں[1] ان ہی ایام میں محمد بن قاسم کی قیادت میں ہندوستان میں بھی فتوحات ہوئیں، مگر اسی کے ساتھ خلافت کے اندرونی نظام میں ابتری بھی پیدا ہو چکی تھی، حجاج کی سفاکی نے ہر طرف بے چینی برپا کر رکھی تھی، اور امراء وحکام میں بھی رقابت، عداوت، حسد اور انتقام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے، اسکی زد میں بڑے بڑے لوگ جو اموی حکومت کے دست و بازو تھے آگئے، محمد بن قاسم بھی اسی میں تھے، چنانچہ وہ ہندوستان کے میدان جہاد سے گرفتار کر کے عراق پہنچائے گئے اور انتقامی جذبات نے

---

[1] العبر ج ا ص ۱۰۶ و ۱۱۴

ان کو واسط کے قید خانہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا،

۹۵ھ میں حجاج نے اپنی موت کے وقت اپنے لڑکے عبد الملک بن حجاج اور یزید بن مسلم کو عراق پر مقرر کیا تھا، اس کے ایک سال بعد ۹۶ھ میں ولید کی موت پر سلیمان بن عبد الملک خلیفہ ہوا، اس نے عبد الملک بن حجاج کی جگہ یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو عراق کی حکومت پر مامور کیا، پھر یزید بن ابی کبشہ اور یزید بن مسلم دونوں کو عراق سے ہٹا کر یزید بن مہلب ازدی کو امیر حرب اور صالح بن عبد الرحمن تمیمی کو امیر خراج بنایا، اس کے بھائی آدم بن عبد الرحمن تمیمی کو حجاج نے خوارج کے ہم خیال ہونے کی بنا پر قتل کیا، خلیفہ سلیمان نے جب یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو عراق سے ہٹا کر سندھ کی امارت عطا کی تو امیر عراق صالح تمیمی نے سابق امیر عراق یزید سکسکی سے ساز باز کر کے اپنے بھائی صالح کا انتقام حجاج کے بھائی محمد بن قاسم سے اس طرح لیا کہ یزید بن ابی کبشہ نے سندھ آتے ہی ان کو گرفتار کر کے یزید بن مہلب دوسرے امیر عراق کے بھائی معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں صالح کے پاس عراق بھیجدیا، اس نے واسط کے قید خانہ میں بند کر دیا، جہاں محمد بن قاسم کے خاندان کے کئی افراد انتقامی جذبہ کا شکار ہو کر شدائد و مصائب برداشت کر رہے تھے، محمد بن قاسم اور دوسرے آل ابی عقیل نے اسی حال میں جان دی، بلاذری نے لکھا ہے:۔

ومات الولید بن عبد الملک	جب ولید کے مرنے پر سلیمان خلیفہ ہوا تو
وولی سلیمان بن عبد الملک	اس نے عراق کے صیغۂ مالیات کا امیر
فاستعمل صالح بن عبد الرحمن	صالح بن عبد الرحمن کو بنایا، اور یزید بن
علی خراج العراق، وولی یزید بن	ابو کبشہ سکسکی کو سندھ کی امارت دی، یزید بن

۱؎ معارف ص، ۱۵، ۱۵۸

ابی کبشة السکسکی السند، فحمل	ابو کبشہ نے محمد بن قاسم کو قید کر کے معاویہ بن مہلب کی نگرانی
محمد بن القاسم مقیدا مع	میں عراق بھیجدیا، اور صالح بن عبد الرحمن نے انکو واسط
معاویة بن المهلب، فحبسه	میں قید کر کے خاندان ابو عقیل کے دوسرے
صالح بواسط فعذبه صالح	افراد کے ساتھ سخت اذیت دی،
فی رجال من آل ابی عقیل	یہاں تک کہ ان سب کو مار ڈالا، حجاج
حتی قتلهم وکان الحجاج قتل	نے صالح کے بھائی آدم کو خوارج
آدم اخا صالح وکان یری رأی الخوارج ۱؎	کا ہم خیال ہونے کے جرم میں قتل کیا تھا،

محمد بن قاسم نے بڑی بہادری اور صبر و استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی، جس وقت انکو سندھ میں گرفتار کیا گیا تو انھوں نے اس ناقدری پر یہ شعر پڑھا:۔

اضاعونی، وای فتی اضاعوا   لیوم کریهة وسداد ثغر

(لوگوں نے مجھے ضائع کر کے ایسے بہادر کو ضائع کیا جو لڑائی کے دن اور سرحد کی حفاظت کے وقت کام آتا)

اور واسط کے قید خانہ میں یہ دو اشعار کہے

فلئن ثویت بواسط وبارضها   رهن الحدید مکبلا مغلولا

(اگر میں آج واسط میں لوہے کی زنجیروں میں ڈوبا ہوا ہوں اور بیڑیوں سے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں تو کوئی غم نہیں)

فلرب فتیة فارس قد رعتها   ولرب قرن قد ترکت قتیلا

کیونکہ میں نے فارس میں بہت سے مردوں کو لرزہ براندام کیا ہے اور کتنے ہی بہادروں کو قتل کر کے چھوڑ دیا ہے

اسی زمانہ میں یہ شعر بھی کہے تھے:۔

لو کنت جمعت القرار لوطئت   اناث اعدت للوغی وذکور

اگر میں زندہ رہتا تو سکون و قرار کی ایسی فضا قائم کر دیتا کہ میدان جنگ میں مرد اپنی بیویوں کے ساتھ عیش کرتے

۱؎ فتوح البلدان ص ۴۲۸

وما دخلت خیل السکاسک ارضنا ولا کان من عک علی امیر

آج یزید سکسکی نے مجھے قید کیا ہے حالانکہ ہمارے وطن طائف میں انکے بہادر شہسوار داخل تک نہیں ہو سکے تھے اور قبیلہ عک میں سے کسی نے ہم پر حکومت و امارت کی تھی،

ولا کنت للعبد المزونی[1] تابعا فیالک دہر بالکرام عثور[2]

اور مزون ازدی مجھے اپنے ساتھ لایا ہے حالانکہ میں کبھی کسی بحرینی غلام کے تابع نہیں ہوا، ہائے زمانہ! شرفا کے ساتھ یہ تیری کیا ٹھوکریں!

اودھر واسط میں محمد بن قاسم قید و سلاسل میں اسیر تھے، اودھر سندھ میں ان کے غم میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی، اور سندھی محمد بن قاسم کی تصویر بنا کر اپنی عقیدت و محبت کا نذرانہ پیش کر رہے تھے، علامہ بلاذری کا بیان ہے،

فبکی اہل الہند علی محمد، وصوروہ بالکیرج[2] — ہندوستان کے باشندے محمد بن قاسم پر بہت روئے اور انھوں نے کیرج میں انکی تصویر بنائی،

اس صاف و صحیح روایت کے مقابلہ میں یعقوبی، ابن حزم اور صاحب چچ نامہ نے اور ہی باتیں بیان کی ہیں، یعقوبی نے تو سرے سے یزید بن ابوکبشہ سکسکی کی سندھ میں امارت کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ سندھ کا والی ہو کر آیا، اور چند ہی دنوں کے بعد مرگیا، اور اسی اثنا میں محمد بن قاسم گرفتار کرکے بغداد بھیجا گیا، اس کے بعد سلیمان نے حبیب بن مہلب کو یہاں کی امارت پر مقرر کیا، جو عراق کے امیر یزید بن مہلب کا دوسرا بھائی تھا، یعقوبی نے لکھا ہے کہ حبیب بن مہلب نے محمد بن قاسم کو گرفتار کرکے اور ٹاٹ کا لباس پہنا کر قید کیا، انکی موت کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی ہے،

[1] ایران والے قدیم زمانہ میں بحرین کو مزون کہتے تھے، اور بنو ازد پہلے بحرین اور عمان کے درمیانی مقام دبا میں رہتے تھے، جو موجودہ دُبئی کے آس پاس تھا، [2] فتوح البلدان ص ۴۴۰

فوجہ سلیمان حبیب بن المہلب الیہا فدخل البلاد، وقاتل قوما کانوا ناحیۃ مہران، واخذ محمد بن قاسم فالبسہ المسوح وقیدہ وحبسہ[1]

خلیفہ سلیمان نے حبیب بن مہلب کو سندھ بھیجا، اس نے یہاں آکر دریائے سندھ کے کنارے پر بسنے والوں سے جنگ کی اور محمد بن قاسم کو پکڑ کر ٹاٹ پہنایا، اور گرفتار کرکے جیل خانہ میں ڈالدیا،

اس میں نہ عراق بھیجنے کا ذکر ہے اور نہ صالح بن عبدالرحمن اور واسط کے قیدخانہ کا کوئی بیان ہے،

علامہ ابن حزم نے ان دونوں باتوں سے الگ بات کہی ہے:

وقتل نفسہ فی عذاب یزید بن المہلب[2] — محمد بن قاسم نے یزید بن مہلب کی ایذا رسانی میں خودکشی کر لی،

مگر ان میں سے کوئی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، یہ واقعہ ہے کہ یزید بن مہلب بھی اس وقت عراق کا امیر تھا، مگر اس کے اور حجاج یا محمد بن قاسم کے درمیان کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ یزید محمد بن قاسم کو گرفتار کرکے خودکشی پر مجبور کرے، بلکہ یہ کام دوسرے امیر عراق صالح بن عبدالرحمن کا تھا، اسی کو حجاج سے شکایت تھی، البتہ محمد بن قاسم کو سندھ سے عراق لانے والا یزید بن مہلب کا بھائی معاویہ بن مہلب تھا، البتہ محمد بن قاسم کے صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم نے ۱۲۶ھ میں سندھ میں محمد بن غزان کلبی کے مصائب کے ڈر سے خودکشی کر لی تھی جس کا ذکر آگے آرہا ہے، ممکن ہے کہ امام ابن حزم کو باپ بیٹے کے معاملہ میں اشتباہ ہو گیا ہو،

محمد بن قاسم کی موت کے سلسلہ میں اتفاقی روایات کے ساتھ ساتھ ایک افسانوی روایت بھی ہے جو تقریباً چھ سو سال گذرنے کے بعد سندھ سے چلی ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے،

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۵۶ [2] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۸

اور بعد کے ہندی مورخوں نے اسے زیب داستان کے طور پر اپنی کتابوں میں درج کر دیا، سب سے پہلے علی بن حامد کوفی اوشی نے چچ نامہ میں لکھا، اس کے بعد نظام الدین بخشی، میر معصوم بھکری اور میر شیر علی قانع تتوی وغیرہ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی دو لڑکیوں سریا دیو، اور پرمل دیو کو خلیفہ ولید کے پاس بھیجا، ولید نے سریا دیو کو اپنے پاس بلایا، تو اس نے کہا کہ ہم خلیفہ کے قابل نہیں ہیں، محمد بن قاسم نے ہم پر دست درازی کی ہے، یہ سنکر خلیفہ نے فوراً محمد بن قاسم کو حکم بھیجا کہ تم جس حال میں بھی ہو خط پاتے ہی اپنے کو کچی کھال میں بند کر کے دربار خلافت میں حاضر ہو، ناچار اس حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور جب ان کی لاش عراق پہنچی تو سریا دیو نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ اور دوسرے راجوں مہاراجوں کا بدلہ لے لیا، خلیفہ کو عقل سے کام لینا چاہیے تھا، اور کسی بات کو محض سنکر فوراً فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا، محمد بن قاسم تو عفت و عصمت میں ہمارے باپ اور بھائی کی طرح تھا، اس کی یہ باتیں سنکر خلیفہ نے ان دونوں کو دیوار میں چنوا دیا۔[۱] اس بے بنیاد کہانی کو بعض مستشرقین نے بھی علم و تحقیق کے نام سے بڑے آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے،

محمد بن قاسم کی عمر فارس کی امارت کے وقت سترہ[۱۷] سال کی تھی، اگر اس کو ۸۳ھ ہی مان لیا جائے تو ان کی ولادت ۶۶ھ میں ہوئی ہوگی اور موت ۹۶ھ میں واقع ہوئی، اس حساب سے ان کی عمر اس وقت کم و بیش تیس[۳۰] سال کی تھی،

نذرانۂ عقیدت | محمد بن قاسم کے محامد و مناقب میں حمزہ بن بیض حنفی اور بعض دوسرے شعرا کے اشعار اوپر نقل کیے جا چکے ہیں، ایک اور ثقفی شاعر نے ان کی ہندوستان کی فتوحات اور یہاں پر ان کی اسلامی خدمات کا اعتراف و اظہار ان اشعار میں کیا ہے:۔

۱؎ چچ نامہ ص ۲۴۲ تا ۲۴۴

فتحت بلاد السند بعد صعوبة ۔۔۔ ومهابة لمحمد بن القاسم

بڑے سخت اور خطرناک حالات کے بعد سندھ کے شہر محمد بن قاسم کے ہاتھ پر فتح ہوئے،

ساس الامور سياسة ثقفية ۔۔۔ بشهامة منه ورای حازم

انھوں نے بڑی جوانمردی، اصابت رائے، دور اندیشی اور ثقفی سیاست سے تمام انتظام درست کیے

اذن الامير له غداة وداعه ۔۔۔ كان الامير مودبا فی العالم

امیر حجاج نے انکو ہندوستان رخصت کرتے وقت جملہ معاملات میں مختار بنا دیا تھا، اور امیر دنیا میں ادب آموز و مودب تھے

ماغاب عنه من الامور رزانة ۔۔۔ فيه اليقين له عيان العالم

فہم و فراست کی وجہ سے کوئی ایسی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہتی ہے جس پر ارباب بصیرت یقین رکھتے ہیں۔

فبرمحه نصر الاله محمد ۔۔۔ وبسيفه قامت نساء الماتم

محمد بن قاسم نے اپنے نیزے سے اللہ کے دین کی مدد کی ہے اور اپنی تلوار سے دشمن کی عورتوں میں صف ماتم بچھا دی ہے

وبكيده سارت بهامة داهر ۔۔۔ دهم البغال الی اغر قماقم[۱]

اور انہی کی جنگی تدبیر سے غبار آلود قافلہ والے راجہ داہر کے سر کو خلیفہ کے روشن چہرہ کے سامنے لے گئے۔

مشہور اموی شاعر جریر نے ایک قصیدہ میں خلیفہ کی مدح کی ہے، جس کے دو اشعار میں محمد بن قاسم کی ہندوستانی فتوحات اور ان کے مناقب و محامد کی طرف اشارہ کیا ہے،

وارض هرقل قد قهرت وداهر ۔۔۔ ويسعی لكم من آل كسری النواصف

تو نے ہرقل شاہ روم اور راجہ داہر کی سرزمین کو مغلوب کیا اور تیری خدمت کے لیے کسرائی خاندان کے غلام دوڑتے ہیں

دانت اليك الهند مافی حصونها ۔۔۔ ومن ارض صينستان يجبی الطرائف[۲]

ہندوستان کے قلعہ جات میں جو کچھ تھا، تجھ کو دیدیا اور سرزمین چین سے تیرے پاس عمدہ عمدہ سامان لائے جاتے ہیں

۱؎ چچ نامہ ص ۱۰۹ ۲؎ کتاب المعرب جوالیقی، مخطوطہ ص ۳۲

عمرو بن محمد بن قاسم ثقفی

محمد بن قاسم جیسے عظیم فاتح کو اموی دور کی سیاست و رقابت نے اس طرح کھو دیا کہ اسلامی تاریخوں میں ان کا اور ان کے کارناموں کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا، ایسی حالت میں ان کے متعلقین اور اولاد کے حالات کہاں سے مل سکتے ہیں، مگر یہ غنیمت ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے عمرو بن محمد بن قاسم ثقفی کے مختصر حالات تاریخ میں مل جاتے ہیں، ان کی امارت و فتوحات کا سب سے زیادہ تذکرہ یعقوبی نے کیا ہے، بلاذری نے اختصار سے کام لیا ہے، اور طبری نے صرف ان کی گرفتاری اور موت کو بیان کیا ہے، تعجب ہے کہ چچ نامہ میں جو سندھ میں محمد بن قاسم کی فتوحات کی سب سے بڑی تاریخ ہے، ان صاحبزادے کا نام تک نہیں ہے تو دوسرے حالات کا کیا ذکر۔

حکم بن عوانہ کلبی کی نیابت میں سندھ میں فتوحات و خدمات

محمد بن قاسم کی موت کے نو دس سال بعد ۱۰۵ھ میں عمرو بن محمد بن قاسم کی شخصیت سندھ میں ایک کامیاب فاتح و مجاہد کی شکل میں نظر آتی ہے، حالانکہ اس حادثہ کے بعد سندھ میں اموی امراء و عمال برابر آتے رہے، اور جنگی سرگرمی دکھاتے رہے، خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں یزید بن ابی کبشہ سکسکی کے بعد حبیب بن مہلب، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں عمرو بن مسلم باہلی، یزید بن عبدالملک کے عہد میں ہلال بن احوز مازنی، اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی خلافت میں جنید بن عبدالرحمن مری اور تمیم بن زید قینی سندھ کے والی رہے، مگر ان میں سے کسی دور میں عمرو بن محمد بن قاسم کا نام نہیں ملتا، یہاں تک کہ ہشام نے والی عراق خالد بن عبداللہ قسری کے مشورہ سے ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ھ میں حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کی امارت پر مامور کیا، اس کی جوہر شناس نگاہ نے عمرو بن محمد بن قاسم کو ڈھونڈ کر نکالا اور اپنے دور امارت کو ان کے فاتحانہ کارناموں سے روشن کیا اور عمرو نے اپنی انتظامی قابلیت سے بڑے مفتوحہ علاقوں کو امن و امان کا گہوارہ بنایا، اور حکم کی امارت میں خود اس کے امیر بن گئے،

بلاذری نے لکھا ہے کہ تمیم بن زید قینی کے انتقال کے بعد خلیفہ ہشام نے حکم بن عوانہ کلبی کو سندھ کا

حاکم بنایا، انھوں نے یہاں کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کیا اور مسلمانوں کے لئے محفوظ نام کا ایک الگ شہر بسایا، اس کے بعد لکھا ہے کہ

وکان عمرو بن محمد بن القاسم	عمرو بن محمد بن قاسم حکم بن عوانہ کے ساتھ تھے،
مع الحکم وکان یفوض الیہ	وہ عمرو بن محمد بن قاسم کو امارت و فتوحات
ویقلدہ جسیم امورہ واعمالہ	کے اہم امور و معاملات سپرد کرتے تھے، چنانچہ
فاغزاہ من المحفوظۃ فلما	انکو محفوظہ سے جہاد کے لیے روانہ کیا اور جب
قدم علیہ وظفر امرہ ان یبنی	وہ جہاد سے مظفر و منصور واپس ہوئے تو
دون البحیرۃ مدینۃ وسماھا	حکم دیا کہ سمندر سے تھوڑے فاصلہ پر ایک شہر
المنصورۃ فھی التی ینزلہا	آباد کریں، حکم نے اس کا نام منصورہ رکھا جو
العمال الیوم[1]	ان دنوں (۲۵۵ھ) امراء و عمال کا دار الامارت

یعقوبی کا بیان ہے کہ حکم بن عوانہ نے ہندوستان کے علاقوں کو متغلبین سے آزاد کرایا اور محفوظ کو آباد کرکے مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بنایا، اور متعدد خونریز لڑائیوں کے بعد پورے ملک میں سکون و اطمینان کی فضا قائم کی، ان تمام کاموں میں عمرو بن محمد اور اعیان و اشراف کی جماعت حکم کی معاون و مددگار تھی،

وکان مع الحکم عمرو بن محمد	حکم کے ساتھ عمرو بن محمد بن قاسم
بن القاسم الثقفی وجماعۃ	اور دوسرے معززین کی ایک
من وجوہ الناس[2]	جماعت تھی۔

اس طرح عمرو بن محمد بن قاسم حکم کی امارت میں ۱۰۵ھ یا ۱۰۶ھ سے ۱۲۰ھ تک

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۱ [2] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۰

ان کے ساتھ رہے، سنہ ۱۲۰ھ میں خلیفہ ہشام نے خالد قسری اور اس کے ماتحت امرا و حکام کا احتساب اور ان کی تادیب کے لیے یوسف بن عمر ثقفی کو عراق کا حاکم بنا کر بھیجا، اس نے عراق پہنچکر خالد قسری اور اس کے نائب امیر بلال بن بردہ پر اتنی سختی کی کہ دونوں ہلاک ہو گئے، حکم بن عوانہ خالد قسری کے مشورہ سے اور اسی کی نیابت میں سندھ کے امیر و حاکم تھے، اس لیے جب اس کو ان واقعات کی خبر ملی تو یہ کہکر دشمن کے دور دراز علاقہ میں جہاد کے لیے نکل گئے کہ یا تو ایسی فتح حاصل کروں گا جس سے یوسف خوش ہو جائے یا شہادت پاؤں گا جو سکون دیدیگی، اور اسی جہاد میں سنہ ۱۲۲ھ میں شہید ہو گئے، حکم کی جنگی سرگرمی سنہ ۱۲۰ھ سے سنہ ۱۲۲ھ تک تقریباً دو سال رہی، اس مدت میں عمرو بن محمد بن قاسم حکم کے نائب کی حیثیت سے سوار فوج کے امیر رہے،

وکان استخلف علی الخیل عمرو بن محمد بن القاسم الثقفی[1]	اس مدت میں حکم نے عمرو کو سوار فوج پر اپنا نائب مقرر کیا تھا،

ان دونوں مورخوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۵ھ یا سنہ ۱۱۰ھ سے سنہ ۱۲۰ھ تک عمرو بن محمد بن قاسم امیر سندھ حکم بن عوانہ کلبی کے ساتھ جملہ امور و معاملات میں برابر شریک رہے اور ملکی و جنگی مہمات سر کیں، بلاذری کی روایت کے مطابق اسی دور میں عمرو نے منصورہ شہر آباد کیا جو حاکم اعلیٰ حکم کے کارناموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح کم و بیش پندرہ سال تک عمرو نے ایک امیر اعلیٰ کے نائب کی حیثیت سے ہندوستان میں خدمات انجام دیں، پھر سنہ ۱۲۰ھ سے سنہ ۱۲۲ھ تک اپنے امیر کی طرف سے گویا مستقل امیر و حاکم رہے،

سندھ کی مستقل امارت وحکومت اور فتوحات و خدمات

حکم بن عوانہ نے اپنی امارت کی ابتدا سے لیکر شہادت کے دن تک عمرو بن محمد بن قاسم کو سیاہ و سپید کا مالک بنائے رکھا، اور جب

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۰۸، ۳۰۹

جہاد کے ارادے سے نکلے تو عمرو ہی کو اپنا جانشین اور نائب بنایا، مگر ۱۲۲ھ میں حکم کی شہادت کے بعد عمرو کے مقابلہ میں جانشینی کے لیے یزید بن عرار نامی ایک شخص کھڑا ہو گیا جس کا پہلے سے کوئی نام و نشان نہیں ملتا، اور عمرو اور یزید میں جانشینی کے لیے سخت کشمکش ہوئی، مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر اس بارے میں یوسف بن عمر ثقفی والی عراق کو لکھا گیا، اس نے معاملہ کی نزاکت دیکھتے ہوئے خلیفہ ہشام کی طرف رجوع کیا۔ ہشام نے کہا کہ اگر عمرو بن محمد بن قاسم کی عمر میں کہولت (پختگی) کو پہنچ چکی ہو تو ان ہی کو سندھ کا امیر بناؤ، چنانچہ یوسف بن عمر نے ثقیف کی طرفداری میں عمرو کو سندھ کی امارت پر مامور کر دیا، حالانکہ وہ ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے تھے، عمرو کو جیسے ہی امارت کا پروانہ ملا، یزید بن عرار کو گرفتار کر کے قید کر دیا،

یعقوبی کے بیان کے مطابق عمرو بن محمد بن قاسم نے اس کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سمندر سے تھوڑے فاصلہ پر شہر منصورہ آباد کر کے اس کو امرا و حکام کا مستقر بنایا، اور یہاں سے غزوات و فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، اور دشمنوں کو شکست دی، مگر شکست خوردہ دشمنوں کی ایک جمعیت نے اپنے ایک آدمی کو راجہ بنا کر اس کی قیادت میں منصورہ کو گھیر لیا، یہ حملہ بہت سخت اور منظم تھا، اس لیے عمرو نے عراق کے گورنر اور اپنے افسر اعلیٰ یوسف بن عمر کو صورت حال آگاہ کیا، اس نے عراق سے چار ہزار تازہ دم فوج روانہ کی، دونوں میں سخت مقابلہ ہوا۔ راجہ شکست کھا کر بھاگ نکلا، عمرو نے معن بن زائدہ شیبانی کو مقدمۃ الجیش کا امیر بنا کر راجہ کا تعاقب کیا، آگے بڑھ کر سامنا ہو گیا، دونوں میں مقابلہ ہوا، راجہ زخمی ہو کر گر گیا، اس کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی، اس کے چند آدمی راجہ کو نیم مردہ حالت میں اٹھا لے گئے، اس معرکہ کے بعد سندھ کا پورا علاقہ زیر نگیں ہو گیا اور یہاں کے تمام راجہ مطیع ہو گئے۔

جس زمانہ میں اسلامی فوج دشمن سے نبرد آزما تھی اور عمرو بن محمد کی توجہ تمامتر غزوات و فتوحات

پر تھی، یزید بن مہلب کے لڑکے مروان بن یزید نے عمرو کے خلاف صف آرائی کردی، امرائے فوج کی ایک جماعت بھی اس کے ساتھ ہوگئی، اس نے عمرو کی فوج کا سامان اور جانوروں کو لوٹ لیا، مگر عمرو بن محمد نے معن بن زائدہ شیبانی اور عطیہ بن عبدالرحمٰن کی مدد سے مروان کو شکست دیدی، جب مروان اور اس کی فوجیں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگیں تو عمرو بن محمد نے اعلان کردیا کہ ابن مہلب کے علاوہ تمام فوجیوں کے لیے امن ہے، اس اعلان پر فوج نے مروان کا پتہ بتادیا اور عمرو نے اسے پکڑ کر قتل کردیا،[1]

عمرو بن محمد بن قاسم نے ۱۲۲ھ سے ۱۲۵ھ تک سندھ میں نہایت کامیاب حکومت کی، یعقوبی کی تصریح کے مطابق منصورہ کو اسی دور میں آباد کیا، سندھ کے راجہ دائے کو شکست دی، اور بہت سی فتوحات حاصل کیں، مروان بن یزید بن مہلب کی بغاوت کو ختم کیا، ۱۲۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے بعد جب ولید بن یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس نے عمرو بن محمد بن قاسم کو سندھ سے معزول کرکے یزید بن عرار کو جسے عمرو نے قید کردیا تھا، سندھ کی امارت و حکومت پر مامور کیا، اس طرح یزید بن عرار کی دیرینہ تمنا پوری ہوگئی، مگر انھوں نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا اور عمرو بن محمد بن قاسم سے کوئی تعرض نہیں کیا، حالانکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ ان سے انتقام لے سکتے تھے، یزید بن عرار نے اپنی تمام توجہ ملکی فتوحات اور انتظامات کی جانب رکھی، اور بقول یعقوبی انھوں نے ہندوستان میں آٹھ غزوات کیے اور ان سب میں کامیابی حاصل کی اور وہ بے حد بہادر آدمی تھے،[2]

موت ۱۲۶ھ

۱۳-۱۴ مہینے حکومت کرنے کے بعد ولید کا انتقال ہوگیا، اور ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید ابن عبدالملک خلیفہ ہوا، اس نے یوسف بن عمر ثقفی کی جگہ منصور بن جمہور کلبی کو عراق کا امیر مقرر کیا، یوسف یہ خبر سنتے ہی شام کی طرف بھاگ گیا، منصور بن جمہور کلبی نے عراق کی گورنری سنبھالتے ہی

۱؎ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۸۹ و ۳۹۰ ۲؎ ایضاً ج ۲ ص ۴۰۰

یزید بن عرار کو سندھ سے معزول کرکے محمد بن غزان کلبی کو سندھ اور سجستان کا امیر مقرر کیا، اس پوری مدت میں عمرو بن محمد بن قاسم معزولی کے بعد سندھ ہی میں رہے، محمد بن غزان کلبی کو عمرو بن محمد بن قاسم نے اپنی ولایت و امارت کے زمانہ میں ایک معاملہ میں بڑی تکلیف دی تھی، اسلیے انتقام کے لیے وہ وقت کا منتظر تھا، چنانچہ اس نے عمرو کو گرفتار کرکے قید کردیا، اس نے مزید ذلت اور تکلیفوں سے بچنے کے لیے خودکشی کرلی،

طبری نے ۱۲۶ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ عمرو بن محمد بن قاسم نے سندھ کی امارت کے زمانہ میں محمد بن غزان کلبی کو گرفتار کرکے مارا تھا، اور والی عراق یوسف بن عمر کے پاس بھیجدیا تھا، اس نے محمد بن غزان کو سزا دی اور ایک بھاری رقم بطور جرمانہ کے اس پر عائد کی، اور حکم دیا کہ ہر جمعہ کو وہ اس رقم کی ایک قسط ادا کرتا رہے جس جمعہ کو قسط ادا نہ کرسکے، اسکو پچیس درّے رسید کیے جائیں، محمد بن غزان کلبی قسط وار رقم ادا نہ کرسکا اسلیے اسکو درّے لگائے گئے، جس کے صدمہ سے اس کی انگلیاں اور ہاتھ سوکھ گئے تھے، اس لیے ۱۲۶ھ میں جب محمد بن غزان سندھ اور سجستان کا حاکم مقرر ہوا تو سجستان میں یزید بن ولید کی خلافت کی بیعت لینے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ عمرو بن محمد بن قاسم کو قید کرکے پولیس کا پہرہ لگادیا، عمرو بن محمد بن قاسم کو اپنی قید کا انجام معلوم تھا، اس سے بچنے کے لیے موقع پاکر ایک سپاہی لیکر اس سے خودکشی کرنے کی کوشش کی، یہ حال دیکھکر لوگوں نے شور مچایا، محمد بن غزان نے باہر آکر یہ صورت دیکھی تو عمرو بن محمد بن ابن قاسم سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ عمرو نے جواب دیا تمھاری سزا کے خوف سے، محمد بن غزان نے کہا میں تم کو کتنی ہی سزا دیتا مگر وہ کام نہ کرتا، جسے تم نے خود کیا ہے، اس حادثہ کے تیسرے دن تلوار کے زخم کے صدمہ سے عمرو بن محمد بن قاسم کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد محمد بن غزان نے سندھ میں بھی یزید بن ولید کی خلافت کی بیعت لی،[1]

۱؎ تاریخ طبری ج ۷، ص ۲۷۲

مراجع ۔ اس مقالہ میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے :۔

(۱) انساب الاشراف، بلاذری، طبع یروشلم (۲) البدایہ والنہایہ، ابن کثیر، طبع مصر (۳) تاریخ الملوک والامم طبری، دارالمعارف مصر (۴) تاریخ یعقوبی، طبع لیڈن، (۵) چچ نامہ حامد بن علی کوفی اوشی، مطبع لطیفی دہلی (۶) جمہرۃ انساب العرب، ابن حزم، دارالمعارف مصر، (۷) کتاب الذخائر والتحف، قاضی رشید بن زبیر، طبع کویت (۸) طبقات ابن سعد، طبع بیروت، (۹) العبر فی خبر من غبر، ذہبی، طبع کویت (۱۰) فتوح البلدان، بلاذری، طبع مصر (۱۱) کتاب الفہرست، ابن ندیم، طبع مصر (۱۲) کتاب المحبر محمد بن حبیب بغدادی، طبع حیدر آباد (۱۳) معجم البلدان، یاقوت حموی، طبع مصر (۱۴) کتاب المعارف، ابن قتیبہ، طبع مصر (۱۵) کتاب المعرب، جوالیقی، قلمی،

پاکستان سے اپیل

دارالمصنفین کے خدمت گذاروں کو اس کا بڑا دکھ ہے کہ پاکستان کے بعض خود غرض ناشرین اس کی بعض مطبوعات کو اپنے لیے چھاپکر اس کو بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں، ادارہ نے ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور مغربی پاکستان کے گورنر اور پاکستان کے صدر کی توجہ اس طرف دلائی ہے، پاکستان میں دارالمصنفین کے ہمدردوں سے بھی اپیل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی دباؤ سے ایسے خود غرض ناشرین کو اس ادارہ کو نقصان پہنچانے سے باز رکھیں ورنہ علم و فن کا یہ دیرینہ ادارہ ختم ہو جائیگا اور اس کا خون پاکستان کے سر رہے گا،

منیجر

ٹونک کے تاریخی مخطوطات

از جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب فضا ایم اے ناظم ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

(۲)

طبقاتِ شاہجہانی ۔ مصنف محمد صادق، اس میں ۸۷۱ مشاہیر علماء و فضلاء، اکابر شعراء، ادباء، مصنفین اور صوفیائے کرام کا بیش بہا تذکرہ ہے، جس میں سوانحی اور تاریخی حالات کے علاوہ سلوک، تصوف اور تہذیب و ثقافت کی جلوہ نمائیاں بھی ہیں، یہ گرانمایہ تذکرہ دس طبقات پر مشتمل ہے، ان طبقات میں تیمور اور اس کے جانشینوں کے دور کے تمام مشاہیر ارباب علم و فضل کے حالات اور ان کے کارہائے نمایاں اور خدمات کا تذکرہ ملتا ہے، طبقات مندرجہ ذیل ادوار پر مشتمل ہیں

(۱) تیمور ۷۷۱-۸۰۷ھ مطابق ۱۳۶۹-۱۴۰۵ء (۲) میران شاہ و شاہرخ ۸۰۷-۸۵۰ھ مطابق ۱۴۰۵-۴۶ء (۳) میرزا سلطان محمد اور الغ بیگ ۸۵۰-۸۵۳ھ مطابق ۱۴۴۷-۹ء (۴) ابو سعید ۸۵۴-۷۳ھ مطابق ۱۴۵۰-۶۹ء (۵) عمر شیخ ۸۷۳-۹۹ھ مطابق ۱۴۶۹-۹۴ء (۶) بابر ۹۰۰-۳۷ھ مطابق ۱۴۹۵-۱۵۳۰ء (۷) ہمایوں ۹۳۸-۶۳ھ مطابق ۱۵۳۱-۵۶ء (۸) اکبر ۹۶۳-۱۰۱۴ھ مطابق ۱۵۵۶-۱۶۰۵ء (۹) جہانگیر ۱۰۱۴-۳۷ھ مطابق ۱۶۰۵-۲۷ء (۱۰) شاہجہاں ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء سے ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء تک سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے اغلب یہ ہے کہ ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۷ء مکمل ہوا، کیونکہ

بعد کے حالات نہیں ہیں، یا اس کے بعد مصنف کا انتقال ہو گیا یا ایسے موانع پیش آئے جس سے مصنف آگے نہیں لکھ سکا، ایتھ کے نزدیک ۱۰۳۶ھ مطابق ۱۶۲۷ء کے قریب قریب یہ مخطوطہ ترتیب دیا گیا ہوگا[۱]۔ اس کے ۱۲ سال بعد تک شاہجہاں سریر آرائے سلطنت رہا، شاہجہاں کا دور ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک ہے، اور اس مخطوطے میں صرف ابتدائی دس سال کا حال ملتا ہے اگر سنہ تصنیف ۱۰۴۶ھ مطابق ۱۶۳۶ء مان بھی لیا جائے تو سنہ کتابت کا پتہ نہیں ملتا لیکن شان خط، کاغذ کی ساخت اور طلائی تزئین دور شاہجہانی کی نشاندہی کرتی ہیں، میری حقیر رائے میں یہ نسخہ شاہجہانی دور کا نوشتہ ہونا چاہیے، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی ناظم محکمۂ آثار قدیمہ ہند (شعبۂ عربی و فارسی) نے نسخۂ ہذا کو دیکھکر یہ رائے قائم کی ہے کہ "بہت آسانی سے اس نسخہ کی کتابت گیارہویں صدی ہجری میں منسوب کیجا سکتی ہے، حالانکہ یہ شاہجہانی دور کا بھی مکتوبہ کہا جا سکتا ہے"۔

اسٹوری نے اپنی کتاب History of Persian litra Tura "تاریخ ادب فارسی" میں لکھا ہے کہ طبقاتِ شاہجہانی کا مصنف محمد صادق نے اپنے بھائی ملا محمد یوسف کاشمیری (م ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۳ء) کو عہد جہانگیری کے شعراء میں شامل کیا ہے، جو محمد صادق ہمدانی مصنف کلمات الصادقین بعینہ مشابہ ہے، محمد صادق ہمدانی کو تاریخ محمدی میں مولانا صادق کاشمیری کے نام سے موسوم کیا گیا ہے[۲]،

طبقات شاہجہانی سے اخذ کرتے ہوئے ریو نے لکھا ہے کہ محمد صادق تقریباً ۱۰۰۰ھ مطابق ۱۵۹۱-۲ء

---

[۱] Catalogue of Persian N/85 in The Library of The India office Vol: I by Hermaun Eth M.A. Phil P.P. 705

[۲] P. 976 a. Kalimatus-Sadikin, one of anthorilias quated in Tarikhe Muhummadi fol. 46 where it is ascrilul to maulana Sadik Kashmiri, probably The author of The Tabate shahjahani. (1039)

میں پیدا ہوئے اور دہلی میں رہے، یہیں وہ ملا کامی (متوفی ۱۰۱۶ھ) اور شیخ حسین کانگار (متوفی ۱۰۱۸ھ) سے ملے اور شاہ عبدالحق دہلوی کے شاگرد ہوئے[۱]، مصنف طبقات نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے نانا حاجی محمد ہمدانی ملتان گئے، پھر دہلی میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی اور یہیں ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۷ء میں انتقال کیا، اپنے ایک اور تذکرہ سلسلۃ الصادقین کا بھی حوالہ دیا ہے اور مآثر جہانگیری لکھنے کا بھی ارادہ ظاہر کیا ہے[۲]؛

طبقات شاہجہانی: - یہ نہایت نادر نسخہ ہے جو اب تک معلوم کیا جا سکا ہے اور غیر مطبوعہ[۳] اس کے دوسرے نسخے بہت کمیاب ہیں، میرے علم میں اس نسخہ کی چار نقلیں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ایک آصفیہ کتب خانہ میں ہے[۳]، دوسری انڈیا آفس کتب خانہ میں[۴]، تیسری برٹش میوزیم میں[۵]، اور چوتھی ٹونک میں[۶]، نسخہ زیر بحث بلحاظ قدامت خطاطی اور تاریخی مواد نہایت اہم اور نادر ہے، اب تک اس پر کام نہیں کیا گیا ہے، اس لیے میں نے اسکو ایڈٹ کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور لندن سے اس کے عکسی نسخے منگوائے ہیں، اہل علم سے استدعا ہے کہ ان کو اس نسخہ کے بارے میں جو معلومات ہوں، راقم کو براہ کرم ان سے مطلع فرمائیں۔

خلاصۃ التواریخ: - اس کے مصنف منشی سجان رائے بھنڈاری ہیں، پٹیالہ میں پیدا ہوئے اس نسخہ کے مختلف ترقیموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زیادہ تر سرکاری عہدیداروں کے منشی رہے ریو اور ایتھے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی، سنسکرت میں بھی ماہر تھے، اور خطاطی، منشی گری اور انشا پردازی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، ریو کے مطابق خلاصۃ التواریخ کے

---

[۱] برٹش میوزیم کیٹلاگ مرتبہ ریو ص ۱۰۰۹ [۲] اسٹوری ص ۵۰۸ و ۱۱۷۱ [۳] کتب خانہ آصفیہ ۱/۲ ص ۲۴۶ نوشتہ ۱۱۵۶ھ سرکار [۴] فہرست کتب خانہ انڈیا آفس ص ۳۶۳ ر ۱/۸ [۵] برٹش میوزیم ریو صفحہ ۱۰۰۹ جلد سوم [۶] سعیدیہ کتب خانہ ٹونک فہرست فن تاریخ از محمد عمران خاں ٹونکی۔

علاوہ خلاصۃ الانشاء بھی ان ہی کی تصنیف ہے، جو بہت نایاب ہے، اس کے کچھ اجزا برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں[1]،

خلاصۃ التواریخ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے چالیسویں جلوس ۱۱۰۷ھ م ۱۶۹۵ء میں بڑی کاوش اور محنت سے لکھی گئی، یہ ہندوستان کی مکمل تاریخ ہے، ابتدائے آفرینش سے عالمگیر تک کے حکمرانوں کے مختصر حالات اور تاریخی واقعات کے ساتھ اس عہد کی تمدنی اور معاشرتی جھلکیاں اور معاشی تبصرے بھی دلچسپ انداز میں ملتے ہیں، اور واد کی ترتیب کے ساتھ پورے ہندوستان کی تاریخ بڑے اچھے انداز میں اور بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے اختصار سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن ضروری اور اہم تاریخی اور سیاسی واقعات چھوٹنے نہیں پائے ہیں،

اس کے مختلف نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ایم ظفر حسن نے ۱۹۱۸ء میں اس کو اڈیٹ کیا ہے، لیکن سیر المتاخرین کا مقدمہ بھی خلاصۃ التواریخ کے اڈیشن سے منسوب کر دیا ہے[2]، ۱۹۰۱ء میں سر جادو ناتھ سرکار نے اس مخطوطے کے کچھ حصوں کا ترجمہ جو ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، شائع کیا ہے، جو ظفر حسن کے اڈیشن کے صفحہ ۲۰ سے صفحہ ۸۳ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح ایلیٹ نے جلد ہشتم میں صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۲ تک اس کتاب کی ببلوگرافی (تاریخی تبصرہ) لکھی ہے، بیوریج نے بھی چند اوراق میں اس مخطوطے پر تبصرہ کیا ہے[3] جہاں تک میرے علم میں ہے، ان کے علاوہ ابھی تک کسی نے نہ اس پر کام کیا ہے اور نہ انگریزی ترجمہ کیا ہے، البتہ میر شیر علی افسوس نے "آرائش محفل" کے نام سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، جو طبع ہو چکا ہے، یہ اہم کتاب اپنی نوعیت کی ایک بیش بہا تاریخ ہے، جو گوناگوں دلچسپ معلومات پر مشتمل ہے

[1] اسٹوری ص ۴۵۳ و ریو جلد اول و دوم [2] Journal of Royal Asiatic socity 1894. PP 733-68

ہمارے ذخیرہ کا نسخہ بارہویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم دیتا ہے، کاغذ سفید بادامی کرم خوردہ اور خط شکست ہے، خط شکست کا رواج اکبر کے دور میں زیادہ تھا لیکن جہانگیر سے عالمگیر تک کم ہو گیا تھا، اور اس کی جگہ خط نستعلیق نے لے لی تھی، عالمگیر کے آخری عہد میں پھر خط شکست کا رواج زور پکڑ چلا تھا، اس لیے یہ نسخہ مغلیہ دور کے آخری زمانہ کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے، کاتب نے ترقیمے میں سنہ کتابت اور اپنا نام نہیں لکھا ہے،

تاریخ گزیدہ :- تاریخ گزیدہ مصنفہ حمد اللہ ابی بکر بن احمد بن نصر بن مستوفی قزوینی المتوفی ۷۵۰ھ، تاریخ اسلام پر ایک جامع اور بصیرت افروز کتاب ہے، جس میں ابتدائے آفرینش سے ۷۳۰ھ سال تالیف تک کے حالات و واقعات درج ہیں، کتاب چھ ابواب، ایک ابتدائیہ اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے، ابتدائیہ میں ابتدائے آفرینش سے بحث کی گئی ہے، باب اول میں انبیائے کرام کا تذکرہ ہے، باب دوم میں سلاطین قبل اسلام کے احوال ہیں، باب سوم میں حضور سرور کائنات کی ذات اقدس، خلفاء راشدین اور صحابہ اور تابعین کا تذکرہ اور بنو امیہ اور بنی عباس کے حالات ہیں، باب چہارم میں اسلامی دور کے سلاطین کو بارہ طبقات میں منقسم کر کے ان کے حالات ہیں، باب پنجم میں ائمہ، علماء اور مشائخ کا ذکر ہے، باب ششم قزوین کے حالات پر مشتمل ہے، جو سب سے مختصر ہے، اس کا ترجمہ مسٹر باربیر ڈی مینارڈ نے ایشیاٹک سوسائٹی جرنل میں کیا ہے[1]، اس کتاب کے خاتمہ پر بطور تتمہ ایک باب ہے، جس میں اولیائے کرام اور سلاطین کے انساب کا بیان ہے،

تاریخ گزیدہ کا جو نسخہ ہمارے ادارے میں محفوظ ہے وہ باب پنجم کی فصل پنجم تک ہے، گویا اس میں ایک فصل کم ہے، اور باب ششم جو قزوین سے متعلق ہے اور خاتمہ اس میں نہیں ہے

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ، مرتبہ ریو جلد اول ص ۸۱

تاریخ کتابت اور کاتب کا نام اس نسخے میں مرقوم نہیں ہے، لیکن رسم الخط اور قلم کی روش سے ظاہر ہو رہا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کا نوشتہ ہے، اس لیے کہ اس کے زیادہ تر نسخے سولھویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے اوائل کے لکھے ہوئے ملتے ہیں، چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک نسخہ ۱۵۱۱ء کا نوشتہ اور بقیہ تین نسخے سولھویں صدی عیسوی کے مکتوبہ ہیں۔[۱]

حبیب السیر:- حبیب السیر مصنفہ غیاث الدین بن ہمام الدین المدعو بخواند میر تاریخ کی ایک جامع کتاب ہے جو تین حصوں پر منقسم اور ہر حصہ چار اجزا پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں شیاطین و اجنہ کا، دوسرے میں انبیائے کرام اور منکرین کا حال ہے، تیسرے میں حضور اکرم کی حیات مقدسہ اور غزوات وغیرہ اور چوتھے جز میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں، حبیب السیر تہران اور بمبئی سے شائع ہو چکی ہے، اس کے متعلق مورلے اور ایلیٹ نے بہت کچھ بحث کی ہے[۲]، ہمارے ادارے میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے وہ ۱۰۶۴ھ کا نوشتہ ہے۔

خلاصۃ الاخبار:- مصنفہ غیاث الدین بن ہمام الدین خواند میر المتوفی ۹۴۲ھ، مصنف نے یہ کتاب ۳۵-۹۰۴ھ میں میر علی شیر وزیر سلطان حسین مرزا کے لیے تصنیف کی تھی، جو ایک مقدمہ، دس مقالات اور ایک تتمہ پر مشتمل ہے، پیش نظر نسخہ اس کا مکمل نسخہ ہے، اس کا ترجمہ میجر ڈیوڈ پرائس نے انگریزی میں کیا ہے، اس نسخہ پر مشہور فہرست نگاروں نے بحث کی ہے[۳]، اس کے مقدمہ میں تخلیق و تکوین کائنات پر بحث ہے، پہلے مقالہ میں انبیائے کرام کا ذکر ہے، دوسرے میں یونانی حکما

۱؎ برٹش میوزیم کیٹلاگ مرتبہ ریو ج ۱ ص ۸۲ ۔ معارف، تاریخ گزیدہ کے ایک قدیم نسخہ مکتوبہ ۸۵۵ھ کا عکس معتمد الدولہ حاجی فرہاد مرزا کا عکس اڈورڈ براؤن نے ۱۹۱۰ء میں گب میموریل سیریز کے سلسلہ میں لندن سے شائع کیا تھا، اور انگریزی میں اسکا مبسوط مقدمہ لکھ کر کتاب کے مندرجہ اسماء و اماکن و قبائل اور کتابوں کا انڈکس ایک مستقل جلد میں شائع کیا ۲؎ انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ مرتبہ ایتھے ۱ ص ۸۲ ۳؎ Elliot. P. 106 Bodleian cat. No 83 to 86 - History of India Vol IV P. 14 Rieu - i. P 96 Morley. P 38

کا حال ہے، تیسرا مقالہ شاہان عرب و عجم پر ہے، چوتھے مقالے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف ہے، پانچویں مقالہ میں خلفائے راشدین اور ائمہ کرام، چھٹے میں خلفائے بنو امیہ، ساتویں میں عباسی خلفاء اور آٹھویں میں ان کے مختلف خاندانوں کے حالات ہیں، نویں میں چنگیز خاں اور اس کی نسل، دسویں میں تیمور اور اس کے اسلاف کا حال ہے۔ اس کا تتمہ ہرات اور اس کے مشاہیر کے حالات پر مشتمل ہے[۱]،

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ۱۰۲۷ھ کا مخطوطہ ہے۔ ہمارے یہاں کا نسخہ ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ء کا مکتوبہ ہے، باقی کئی نسخے بارہویں صدی ہجری کے مکتوبہ ملتے ہیں۔

نگارستان:- مصنفہ ابن محمد احمد المعروف بہ قاضی احمد غفاری، تاریخ ایران پر ایک نایاب کتاب ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود سے دسویں صدی ہجری کے اوائل تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں ایران کے مختلف حکمراں خاندانوں کے حالات، ان کے عہد کے واقعات اور مشہور داستانوں کو نظم میں لکھا گیا ہے، اور شاہ طہماسپ شاہ ایران کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۹۵۹ھ مطابق ۱۵۵۲ء ہے، تاریخی مادہ "نگارستان وقع" سے نکلتا ہے[۲]، دنیا کے جن جن کتب خانوں میں اس کے نسخے محفوظ ہیں، اسٹوری نے ان کا حوالہ دیا ہے[۳]، اور گرافٹ کے کیٹلاگ میں اسکا تفصیلی ذکر ہے[۴]، مصنف نے اس کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب الموسوم بہ جہاں آرا لکھی ہے، حرمین شریفین کی زیارت سے مراجعت میں دیبل سندھ میں ۹۷۵ھ میں انتقال کیا، نگارستان کے متعلق ریو کے کیٹلاگ کے علاوہ مورلے کے کیٹلاگ ایلیٹ کی ہسٹری جلد دوم ص ۵۰۴ اور پٹرس برگ کے کیٹلاگ میں خاصی تفصیل ملتی ہے۔ اسکا ترجمہ ترکی میں ہوا تھا، جس کا مسودہ محفوظ اور اب تک طبع نہیں ہو سکا ہے[۵]۔

۱؎ فہرست انڈیا آفس لائبریری ایتھے ۳۴ ۲؎ ریو، جلد ۱ ص ۱۰۶ ۳؎ پرشین لٹریچر از سی، اے، اسٹوری ص ۱۱۴ ۴؎ گراف کیٹلاگ ص ۸، ۱۰ تا ۹۰ ۵؎ اورنٹیل کالج میگزین ج ۲ شمارہ ۵ ص ۳ مئی ۱۹۳۶ء ۶؎ برٹش میوزیم کیٹلاگ مرتبہ ریو ج ۱ ص ۱۰۶

بہجۃ العالم (فارسی) :۔ مصنفہ حکیم مہارت خاں اصفہانی ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے زمانہ تقریباً ۱۱۳۰ھ مطابق ۱۷۱۸ء کی تصنیف ہے، اس میں تمام شہروں کے مختصر جغرافیائی حالات ہیں، کرمان، شوشتر، سیستان، قندھار، غزنی، لاہور، دہلی، آگرہ، اودھ یروشلم وغیرہ کے حالات کسی قدر تفصیلی ہیں، صوبجات ہند کا حال مرأت العالم سے ماخوذ ہے، یہ ایک قسم کی جغرافیہ آمیز تاریخ ہے، اسی میں ایک کتاب روضۃ الافراح مجلد ہے، جو عربی جغرافیہ کی کتابوں تحفۃ الاحباب اور خریدۃ العجائب سے ماخوذ اور اس کا ترجمہ ہے، یہ کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ ذکر از بلاد متفرقہ میں رومی ممالک کا حال ہے جو ہشت بہشت سے ماخوذ ہے، اسی کے ساتھ ہندوستان کا ذکر ہے، جو آئین اکبری سے ماخوذ ہے، اسی طرح مختلف صوبجات اور مشہور شہروں کے حالات انیس العارفین سے لیے گئے ہیں، دوسرا حصہ ذکر بعضے از عجائب خزائن جس میں عجائب و غرائب کا ذکر ہے، عجائب المخلوقات سے اخذ کیا گیا ہے، ہمارے ذخیرہ کے بہجۃ العالم اور روضۃ الافراح کے نسخے ایک ہی جلد میں مجلد ہیں، بہجۃ العالم کا نسخہ ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام غلام علی القرشی ہے، ابھی تک اس کے تراجم، طباعت و اشاعت کا پتہ نہیں چل سکا، قارئین کرام سے استدعا ہے کہ اس کے بارہ میں ان کو جو معلومات ہوں اس سے راقم کو آگاہ فرمائیں[۵]۔

تحفۃ العالم (فارسی) :۔ عبد اللطیف بن ابی طالب بن نور الدین بن نعمت اللہ الحسنی الموسوی الشوستری، مصنفہ ۱۲۱۵-۱۶ھ، اس کتاب میں مصنف نے اپنے ملک شوستر اور اسکے پرگنوں کے حالات کے علاوہ اپنے سوانح بھی بیان کیے ہیں، اور ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی ابتداء قیام اور توسیع کی بھی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں، اور انگریزی طور وطریق، آداب مجالس

[۵] انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول مرتبہ ایتھے صفحہ ۵۰۰

امریکہ اور یورپ کے مشہور شہروں کا بھی ذکر ہے، ہندوستان کی تاریخ، یہاں کی معاشرت اور دوسرے دلچسپ حالات نسبتاً زیادہ ہیں، اس طرح یہ کتاب تاریخ، جغرافیہ اور معاشرت مختلف قسم کے معلومات پر مشتمل ہے، مصنف نے یہ کتاب اپنے ذی شان دوست میر عالم بہادر وزیر اعظم دولت نظامیہ دکن کے نام معنون کی ہے، آخر میں وہ حیدرآباد سے ایران واپس چلے گئے، تحفۃ العالم بمبئی ۱۸۴۷ء میں چھپ چکی ہے، ہمارے کتب خانہ کا نسخہ ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء کا نوشتہ اور نہایت دیدہ زیب، مزین، مطلّٰی اور مذہب ہے، کاغذ سفید لوح کتاب مطلّٰی مینا کار اصفہانی ہے، کاتب کا نام شیخ عبد اللہ عرف امیر الدین خلف عنایت اللہ ہے، ترقیمہ میں کاتب کا نام، سنہ کتابت اور مقام کتابت (سورت) لکھا ہوا ہے، آخر میں ایک مہر بھی ہے جو محو شدہ ہے۔

تاریخ الخمیس فی احوال النفس النفیس (جلد دوم، عربی) :۔ قاضی حسین بن محمد الدیار بکری المالکی متوفی ۹۶۶ھ کی مشہور تصنیف ہے، مصنف مکہ معظمہ کے جید عالم تھے، یہ نسخہ ایک مقدمہ تین ارکان اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ اور ارکان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، ہجرت اور دوسرے تاریخی حالات بیان کئے گئے ہیں، خاتمہ میں خلفائے راشدین اور اموی اور عباسی خلفاء کے حالات ہیں[۱]، ہمارے یہاں دونوں جلدیں محفوظ ہیں جو الگ الگ سنین کی مرقومہ ہیں، جلد اول ۱۰۹۶ھ ہجری کی نوشتہ ہے، اس کے کاتب کا نام علی بن سلمان بن ابراہیم ہے، اس جلد میں ۵ھ تک کے حالات ملتے ہیں، جلد دوم ۱۰۳۱ھ کی نوشتہ ہے، اس میں ۵ھ سے سلطان مراد ثالث تک کے حالات ہیں، اس جلد کے ترقیمہ میں کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے، لیکن طرز کتابت، روش قلم اور نشان خط سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ دوسری جلد بھی

[۱] انڈیا آفس کیٹلاگ جلد اول مرتبہ ایتھے صفحہ ۵۰۰

علی بن سلمان کے قلم کی ہے، یہ کتاب متعدد بار مصر وغیرہ سے چھپ چکی ہے،

تاریخ چین (اردو) کارکرن مصنف جوہر اخلاق ومترجم عدالت دیوانی صدر کلکتہ کی مصنفہ ہے، مولانا محمد عمران خاں اس کتاب کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "یہ ممالک چین کی مکمل تاریخ ہے، جس میں طوفان نوح سے لیکر ۱۸۴۲ء تک کے حالات و واقعات قلمبند کیے گئے ہیں، یہ نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد میں حدود مملکت چین، اس کے صوبہ جات اور انکے معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات و واقعات ہیں، دوسری جلد میں حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر تمام شاہان خطا کا ذکر ہے اور ان ممالک و جزائر کا حال بھی ہے جو سلطنت خطا میں شامل یا اس کے خراج گذار تھے، نسخہ ہذا کے ترقیمہ میں سنہ کتابت ۱۲۷۱ھ دیا ہوا ہے، لیکن کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ کاغذ سفید کرم خوردہ شکستہ۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں کلکتہ میں اور ۱۸۶۵ء میں دار العلوم میرٹھ سے طبع ہو چکی ہے،

تاریخ ہندوستان (فارسی): یہ تاریخ حقی کے نام سے زیادہ مشہور ہے، سلطان معز الدین محمد بن سام سے لیکر اکبر اعظم تک کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف مولوی عبد الحق نے مقدمہ میں اپنا تخلص حقی بتایا ہے، اس نسبت سے اس کتاب کا نام تاریخ حقی ہے، عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اور بختاور خاں نے مراۃ العالم میں حقی کے حالات لکھے ہیں، فاضل مورخ نے اس کتاب کی تصنیف میں اپنے ذاتی مشاہدات اور زبانی روایات دونوں سے کام لیا ہے آخر میں لکھا ہے کہ خاطر خواہ ماخذ اور ذرائع نہ ملنے کی وجہ سے دکن کی تاریخ ۱۹۳۷ء سے آگے نہیں لکھ سکے، لیکن سندھ اور کشمیر کے رؤسا کے حالات تحریر کیے ہیں۔ اس شعر سے اسکا سنہ تالیف نکلتا ہے:

نقص چو افتاد سال تاریخش را — از ذکر ملوک ۱۱ نقص کن

ذکر ملوک کے کل اعداد ۱۰۱۶ ہوتے ہیں، اس میں سے گیارہ نکالنے کے بعد ۱۰۰۵ باقی رہتے ہیں، یہی سنہ تالیف ہے[1]، ہمارے یہاں کا نسخہ آخوند قائم الدین بن آخوند غلام حیدر مشہور خطاط کا نوشتہ ہے۔ ترقیمہ میں کاتب نے تاریخ کتابت نہیں لکھی ہے،

تاریخ مدینہ (فارسی): مصنف نامعلوم الاسم، اول اور آخر سے ناقص ہے، اور آخر کے کئی باب کم ہیں، اس میں سترہ باب ہیں، اور ہمارے یہاں کے نسخہ میں کل پانچ باب ہیں[2]،

تبییض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنیفہ } جلال الدین سیوطیؒ، کاتب نے تاریخ کتابت اور اپنا نام نہیں لکھا،

تاریخ صوبجات ہند (فارسی): اس کے مصنف کا پتہ نہیں چل سکا، معلوم ہوتا ہے مصنف اصل کتاب کا [illegible] نہیں کر سکے، خط شکست ہے، راقم نے جستہ جستہ اس کو دیکھا ہے، مکمل مط[illegible] نہیں [illegible] سکا، کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اقالیم عالم کی تقسیم پھر صوبہ جات ہند کی تفصیل ہے، اور شاہان مغلیہ کی مشہور عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے مصارف کی تفصیل دی گئی ہے، تاج محل سے متعلق حصہ تاریخ تاج گنج (جس کا ذکر مضمون کی پہلی قسط میں آچکا ہے) کے متن سے ملتا جلتا ہے، دونوں میں تاج محل کی تاریخ، اسکے مصارف اور نوادر کا ذکر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ تاریخ تاج گنج سے یا تاریخ تاج گنج اس سے ماخوذ ہے، کتاب کے اول و آخر صفحہ پر ایک ثبت ہے، جس میں ظہور علی ۱۲۲۴ھ کندہ ہے، آخر میں اکبر کی وفات اور سکندرہ کی تعمیر کا بیان ہے[3]،

---

[1] ریوج ۱ ص ۲۲۳ [2] فہرست نمبر ۱ ادارہ تحقیقات علوم مشرقیہ ٹونک [3] اس مخطوطہ کے بارے میں پہلی قسط میں لکھا جا چکا ہے کہ اسوقت تاریخ تاج گنج سے اس کا مقابلہ نہیں کیا گیا تھا، دونوں نسخوں میں نسخہ ہذا قدیم معلوم ہوتا ہے، یہ پہلی قسط میں سہواً دور اکبری کا نوشتہ لکھا گیا ہے، اصل میں یہ دور شاہجہانی کے اواخر یا عہد عالمگیری کے اوائل کے نوشتہ نسخے کی نقل معلوم معلوم دیتا ہے، براہ کرم اس کی صحت کر لی جائے۔

چہار گلشن (فارسی) :۔ رائے چترمن کایستھ کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے، یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جو ابتدا سے لیکر ۱۱۷۳ھ م ۶۰-۱۷۵۹ء تک ہندوستان کے تاریخی واقعات پر مشتمل ہے، اس کا سنہ تالیف "چترمن نیک گلشن" سے نکلتا ہے، مصنف نے وزیر غیاث الدین خاں کی فرمائش پر احمد شاہ ابدالی کے دوسرے حملے کے دوران میں یہ کتاب لکھی تھی، اس کی تدوین کے بعد ہی مورخ کا انتقال ہوگیا، اس لیے ان کے پوتے رائے زادہ چندر بھان منشی کایستھ نے ۱۲۰۴ھ م ۹۰-۱۷۸۹ء میں اس کو مرتب کرکے ایک مقدمہ کا اضافہ کیا، چہار گلشن کے نام کی مناسبت سے یہ چار گلشنوں میں تقسیم ہے،[1] گلشن اول میں صوبجات ہند کا اور گلشن دوم دکن کے صوبوں کا بیان ہے، گلشن سوم میں دلی سے ہندوستان کے دوسرے مقامات تک جو سڑکیں، راہیں اور شاہراہیں جاتی ہیں، ان کا ذکر ہے، اور گلشن چہارم میں مسلم اور ہندو فقراء کا تذکرہ ہے، سر جادو ناتھ سرکار نے "چہار گلشن کے کچھ حصوں کا ترجمہ انگریزی میں اپنی کتاب" اورنگزیب کا ہندوستان The India of Aurangzeb میں کیا ہے۔[2] ایلیٹ نے بھی اپنی کتاب میں اس کے بارے میں مختصراً لکھا ہے،[3]

چہار گلشن کے خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، برٹش میوزیم میں انیسویں صدی عیسوی کا نوشتہ نسخہ ہے اور انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارہویں صدی عیسوی کا مکتوبہ ہے، بالڈون میں ۱۲۰۳ھ م ۱۷۸۹ء کا لکھا ہوا، بانکی پور میں انیسویں صدی عیسوی کا اور کتب خانہ آصفیہ میں تیرہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، ہمارے ادارہ میں نسخہ ہذا کی کتابت درج نہیں ہے لیکن یہ تیرہویں صدی ہجری کا مرقومہ معلوم پڑتا ہے، اس لیے کہ اس نسخہ پر نواب

[1] ریو نے اپنی کیٹلاگ میں گلشن کے بجائے چمن لکھا ہے، ریو جلد ۳ ص ۹۰۹ [2] The India of Aurangzeb از سر جادو ناتھ سرکار، ص ۸۰-۱۲۳ [3] ہسٹری آف انڈیا (انگریزی)، ایلیٹ ج VIII ص ۶-۲۵۵

وزیرالدولہ بہادر خلد مکانی دویم فرمانروائے ٹونک (۱۸۳۴ء سے ۱۸۶۴ء) کی مہر ثبت ہے،[1]

حدیقۃ الاقالیم (فارسی) :۔ یہ ایک جغرافیائی کتاب ہے لیکن کہیں کہیں اس میں تاریخی حالات وواقعات دیے گئے ہیں، اسلیے یہ جغرافیہ اور تاریخ دونوں پر محیط ہے، مرتضیٰ حسین مخاطب باللہ یار عثمانی بلگرامی نے شاہ عالم ثانی کے عہد حکومت میں اسکی تصنیف کی، اس میں ساتوں اقالیم کا مفصل ذکر ملتا ہے، اور ہر اقلیم کے مشاہیر علماء اور حکماء کے حالات بھی قلمبند کیے گئے ہیں،[2] ہمارے یہاں کا نسخہ ۱۲۳۵ھ کا نوشتہ ہے، اول صفحہ پر نواب وزیرالدولہ بہادر خلد مکانی اور نواب یمین الدولہ محمد علی خاں بہادر خلد آشیانی کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں، یہ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ سے چھپ چکی ہے۔

ترجمہ تاریخ فتوح لاحمد بن اعثم کوفی (فارسی) :۔ یہ مخطوطہ فتوح لاحمد کا فارسی میں ترجمہ ہے۔ نگارستان میں اسکا نام احمد بن محمد مستوفی مرقوم ہے، جو امیر قوام الدین کے حکم سے ترجمہ کرنے پر مامور کیے گئے، اس کتاب میں خلفائے راشدین اور انکے دور کے جو مسلم غزوات ہوئے اسکا ذکر کیا گیا، امیر قوام الدین کا انتقال ساتویں صدی ہجری کے عشرہ اول میں ہوا، گویا ساتویں صدی ہجری میں اس کا ترجمہ کیا گیا، عربی مورخین کی نظر سے شاید یہ نسخہ نہیں گذرا، اس کے اصلی عربی نسخہ کا پتہ نہیں چل سکا ہے، نگارستان اور روضۃ الاحباب میں حوالہ ملتا ہے، مصنف کا نام (ابو محمد) احمد بن اعثم کوفی دیا ہوا ہے، برخلاف اس کے میر خواند بمبئی ایڈیشن کے مطابق ان کا نام محمد بن علی بن اعثم بتایا گیا ہے، فتوح ابن اعثم کا مورے کیٹلاگ میں بھی ذکر کیا گیا ہے، مترجم نے مقدمے میں اپنے حالات زندگی دیے ہیں، اور خوارزم اور خراسان کے اکابر کا طرۂ امتیاز وشان امارت بتائی گئی ہے،[3] ہمارے یہاں کا مخطوطہ ۱۲۱۷ھ کا نوشتہ ہے، حاجی سہراب اس کے کاتب ہیں، قدرے کرم خوردہ اور مرمت شدہ ہے

(باقی)

[1] مزید دیکھیے ریو (Rieu) جلد سوم صفحہ ۱۰-۹۰۹ اور اسٹوری صفحہ ۲،۴ [2] مزید دیکھیے Rieu جلد سوم ص ۹۹۲ [3] Rieu جلد اول ص ۱۵۱

وفیات

ذاکر صاحب

از سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

گورنری کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو وہ ۱۹۶۲ء میں جمہوریۂ ہند کے نائب صدر منتخب کرلیے گئے،

اُن کے اس اعزاز پر ہم دارالمصنفین والوں کو بڑی خوشی ہوئی، ان کی نائب صدارت کے زمانہ میں مجھکو بارہا ملنے کا اتفاق ہوا، ہر موقع پر انکی ملنساری، وضعداری، خاکساری اور محبت کو پہلے سے زیادہ پایا، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن ۱۹۴۷ء سے تھے، اس حیثیت سے بھی دارالمصنفین کے تمام لوگوں سے محبت کرتے، اور اس کے کاموں سے دلچسپی رکھتے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رحلت کے بعد خود ہم لوگ مشکوک تھے کہ معلوم نہیں اسکا علمی و تحقیقی معیار باقی رہ بھی سکے گا کہ نہیں، ڈاکٹر ذاکر صاحب سے جب ملتا اور دارالمصنفین کا ذکر آتا تو اسکے معیار کے برقرار رہنے کی تعریف کرکے حوصلہ افزائی فرماتے، ایک بار میں نے انکی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس کے شروع میں میرے قلم سے نکل گیا تھا کہ "امید ہو کہ آپ مجھکو بھولے نہ ہونگے"، اسکا جواب اپنے ایک سرفرازنامہ مورخہ ۳ اگست ۱۹۶۳ء میں دیا، تو تحریر فرمایا کہ "یہ بدگمانی آپ کو کیوں ہو کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، حافظہ تو میرا کچھ اچھا نہیں رہا ہے، لیکن آپ کو بھلانا تو میرے حافظہ کے لیے بھی مشکل ہو۔" ان فقروں میں خود بلند رتبہ کاتب کی شرافت طبع کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، دارالمصنفین میں تاریخ ہند پر جو کام ہو رہا تھا، اسکی پندرہ جلدیں انکی خدمت میں مذکورہ بالا خط کے ساتھ بھیجی تھیں، انکے متعلق لکھا "تاریخ ہند سے متعلق دارالمصنفین کی مطبوعات کا پورا سٹ مجھے مل گیا، کن لفظوں میں آپکے اس کرم کا شکریہ ادا کروں بعض کتابیں تو پہلے نظر سے گذر چکی ہیں لیکن اس پورے سٹ

سے کام کی وسعت اور نوعیت کا وہ اندازہ ہوتا ہے جو مجھے پہلے نہ تھا، آپنے ایک بڑا کام اٹھایا ہے، دعا ہے کہ آپکے ہی ہاتھوں تکمیل کو پہنچے، آپ کی یکسوئی، مستعدی اور خلوص سے یقین ہو کہ اس دعا کو قبولیت نصیب ہو جائے گی۔"

اسی سال میں نے تاریخ ہند کی ۲ دو نئی جلدیں اور انکی خدمت میں بھیجیں تو اپنے ایک مکتوب مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۶۳ء میں تحریر فرمایا "مطبوعاتِ دارالمصنفین کی دو جلدیں "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے" اور "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے" مجھے ملیں، جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، بہت خوب کام ہے، اس عہد کی تمدنی تاریخ پر بہت اچھی اور تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے، یہ دونوں کتابیں، آپ جس مستعدی اور یکسوئی سے اپنے اسلاف کرام کے تفویض کردہ کام کی تکمیل کر رہے ہیں، اس پر بے ساختہ دل سے صدائے آفریں نکلتی ہے، مبارک ہو۔"

ذاکر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کام کرنے والوں کو اپنی پیاری پیاری باتوں سے انکی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارتے، بلکہ اکسا کر ان کو اور بھی زیادہ مستعدی سے کام کرنے کی ہمت دلاتے، یہ تحریریں انکی ان ہی خوبیوں کے نمونے ہیں، وہ اپنے خطوط میں مجھکو مجی، محب گرامی، محب گرامی سید صباح الدین عبدالرحمن زاد لطفہ، سے مخاطب کرتے، میں نے ان کو توجہ دلائی کہ میری حیثیت تو آپکے ایک ادنیٰ شاگرد کی ہے، مجی پڑھکر شرمندہ ہوتا ہوں تو اس کے جواب میں دو تین خطوط میں مکرم بندہ سے مخاطب فرمایا، اس سے اور بھی ندامت ہوئی، اور پھر مجی لکھنے لگے، یہ انکی بلندی اخلاق اور خاکساری کی دلیل تھی، میں جب جب دہلی جاتا تو اعظم گڈھ سے روانہ ہوتے وقت خوش رہتا کہ دہلی میں ان سے مل کر انکے لطف و کرم سے سیراب ہونے کا موقع ملے گا، اور ان ہی کی محبت بھری باتوں کی سوغات اعظم گڈھ لاتا،

ایک بار جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی بھی ہمسفر ہوئے، ہم دونوں ذاکر صاحب سے ملے، تو دیر تک بڑی بے تکلف مجلس رہی، ہم دونوں رخصت ہونے لگے تو ذاکر صاحب اپنی برساتی تک پہنچانے آئے، رات کا وقت تھا، شاہ صاحب نے رخصتی مصافحہ کیا تو ذاکر صاحب کچھ دیر تک روبرو کھڑے ہو کر انکا ہاتھ پکڑے رہے، اور دونوں کے چہروں پر ایک بہت تیز بجلی کا بلب جل رہا تھا، ذاکر صاحب شاہ صاحب کے وجیہہ چہرے کو دیکھکر بولے ماشاء اللہ چہرہ پر نور برس رہا ہے،

شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی نہیں، یہ جمال ہمنشیں کا عکس ہے"، ذاکر صاحب بے ساختہ ہنس پڑے، میں نے فوراً ہی کہا اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ کابل کے مشہور شاعر سرور خاں گویا ۱۹۳۶ء میں ہندوستان آئے تھے، وہ آپ سے بھی جامعہ ملیہ میں ملے تھے، پھر دہلی سے لکھنؤ ہوتے ہوئے اعظم گڈھ بھی پہنچے تھے، انھوں نے ایک گفتگو کے سلسلہ میں حضرت سید صاحب (یعنی مولانا سید سلیمان ندوی) سے کہا کہ میں نے ہندوستان میں حسین ترین آدمی ڈاکٹر ذاکر حسین کو پایا، یہ سنکر ذاکر صاحب نے فرمایا "اخاہ! آپ نے یہ بات بہت دیر میں بتائی اگر پہلے بتائی ہوتی تو میں اسکو سند کے طور پر استعمال کرتا رہتا"۔

اس پرلطف ملاقات کے بعد ہم دونوں ذاکر صاحب کی کوٹھی سے براہ راست ایک دعوت میں پہنچے جہاں ہم لوگوں کی خاطر کچھ اور معززین بھی بلا لیے گئے تھے، ان میں کچھ سرکاری عہدیدار اور کچھ اخبار کے اڈیٹر بھی تھے، میری شامت آئی تو اثنائے گفتگو میں ذاکر صاحب کے یہاں جو دلچسپ باتیں ہوئی تھیں، انکو دہرا دیا، سامعین سنکر خاموش ہو گئے، انھوں نے ان باتوں سے نہ لطف لیا اور نہ ان پر تبصرہ کیا، بلکہ محض سن لیا، پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ان لوگوں نے خود ذاکر صاحب کو موضوع بنایا جس کو سنکر ہم دونوں کو اندازہ ہوا کہ یہ سب اُن کے ناقدین میں سے ہیں، پھر ان کے منہ میں جو کچھ آیا سب کہہ گئے، "وہ ہندو نواز ہیں"، "ہندوؤں کو صرف خوش رکھنا چاہتے ہیں"، "بلوے فساد ہوتے رہتے ہیں مگر مسلمانوں کی حمایت میں کچھ نہیں کرتے" وغیرہ، مجھکو افسوس ہوا کہ میں نے اس مجمع میں ذاکر صاحب کا نام ہی کیوں آنے دیا۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل اورنٹیل کانفرنس کا ۲۶ واں اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، مجھکو بھی ایک مقالہ اس کے اسلامک اسٹڈیز سیکشن میں پڑھنا تھا، دنیا بھر کے مستشرقین کا بڑا اچھا اجتماع تھا، میں نے دہلی جانے سے پہلے حسب معمول ذاکر صاحب کو ایک خط لکھکر ان سے ملاقات کا وقت مانگا، اورنٹیل کانفرنس کے شرکا راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ہند جناب رادھا کرشنن کی طرف سے ایٹ ہوم میں مدعو تھے، میں نے بھی اس میں شرکت کی، لیکن رادھا کرشنن اپنی علالت کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ سکے، انکی نیابت ذاکر صاحب نے کی،

جانے کے بعد وہ سب بے تکلف ملے، مجھ سے بھی ملاقات ہوئی تو فرمایا "گھر پر آکر ضرور ملئے"، جب رخصت ہونے لگے تو ایک اونچے تخت پر کھڑے ہو گئے، دونوں ہاتھ جوڑ کر رخصتانہ سلام کیا، اُس وقت میرے پاس ایک کٹر اہل علم نیشنلسٹ مسلمان کھڑے تھے، جو آگے چل کر راجیہ سبھا کے رکن بھی ہوئے، انھوں نے ذاکر صاحب کو اس طرح ڈنڈوت کرتے دیکھا تو بولے ہمارے تم لوگوں نے ذاکر صاحب کو یہی سوغات دی ہے، پہلے تو اس طرح سلام نہیں کرتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے تو کبھی بھی اس طرح سلام نہیں کیا، یہ محض ہندوؤں کو خوش کرنا ہے"، میں اس وقت یہ سننے کو تیار نہ تھا، دل میں ایک چوٹ لگی، مگر ہنسکر انکو یہ جواب دیا

غمزۂ خاص بہر گبر و مسلمان دارد

اور میں زبان حال سے کہہ رہا تھا

ذاکر کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اور جب راشٹرپتی بھون سے رخصت ہو رہا تھا، تو ذہن پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ لوگ اپنی محبت میں ان کو جامعہ ملیہ ہی کا مرد مومن ہر حال میں دیکھنا چاہتے ہیں، کاش ان سے کوئی بات ایسی سرزد نہ ہوتی کہ جس سے ان کی محبوبیت اور عظمت میں فرق آتا، میں پھر انکی کوٹھی پر جا کر ملا، ان سے عرض کیا کہ اسی سال دارالمصنفین کی طلائی جوبلی منانے کا خیال ہے، آپ سے بڑھ کر اس جشن کے افتتاح کے لیے کوئی اور آدمی موزوں نہیں ہے، انھوں نے بڑی خوشی سے میری دعوت قبول فرمالی، ان سے یہی توقع تھی، کیونکہ ان کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ رہا، پھر اس کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف قسم کے مشورے دیر تک دیتے رہے، میں ان سے ایک بار پھر شاد دل و فرحاں ہو کر رخصت ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی اور میں دونوں بمبئی گئے ہوئے تھے، وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے کہ ذاکر صاحب سے گفتگو کر کے جشن کی تاریخ مقرر کر لیجائے، وہ حسب معمول بہت ہی محبت سے ملے اور تاریخ ۲۰، ۲۱ فروری ۱۹۶۵ء مقرر کی، اسی اثنا میں آزاد بھون کے ایک ڈنر میں جناب عبدالکریم

چھاگلا سے میری ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں وزیر تعلیم تھے، میں نے ان کو شبلی اکیڈمی کی جوبلی میں مدعو کیا، وہ مولانا شبلی اور شبلی اکیڈمی سے بالکل واقف نہ تھے، انگریزی میں پوچھنے لگے، مولانا شبلی کون تھے اور کیا یہ اکیڈمی آرٹ کی اکیڈمی ہے؟ میں نے اس کا ذکر ذاکر صاحب سے کیا تو ہنس کر فرمایا کہ کہہ دیا ہوتا کہ یہ رقص و سرود کی اکیڈمی ہے، چلتے وقت تین ہزار کی رقم بھی دار المصنفین کو عطیہ کے طور پر دی، اس موقع پر اپنے پھولوں کا چمن بہت شوق سے دکھایا، جس میں گلابوں اور بوگن ویلا کی بڑی بہار تھی، ان کے چمن میں گلابوں کی چار سو قسمیں تھیں جو انھوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں بلکہ انگلستان، فرانس اور جرمنی سے بھی منگائی تھیں، ان کے اس ذوق کو دیکھ کر گلاب کے ماہرین بھی ان کے پاس تحفے بھیجا کرتے تھے، صوبہ بہار میں دیو گھر میں گلابوں کی بہت سی قسمیں تیار ہوتی ہیں، وہاں اسکے ماہر ایک مسٹر بھٹاچارجی تھے، وہ ذاکر صاحب سے بہار کی گورنری کے زمانے میں ملے، تو ان کے اس شوق کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے گلاب کی ایک قسم کا نام ذاکر حسین ہی رکھ دیا، جو اب اسی نام سے مشہور ہے، ذاکر صاحب نے اپنی کوٹھی میں ہم لوگوں کو ایک ایسا بوگن ویلا بھی دکھایا جس میں کئی رنگ کے پھول تھے، میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ اس کی تحقیق نہ کیجئے، آپ اپنی علمی و ادبی تحقیقات ہی میں رنگ برنگ کے پھول پیدا کرنے میں لگے رہیں"۔

دار المصنفین واپس آکر طلائی جوبلی کے جشن کی تیاری شروع کر دی، جناب شاہ معین الدین اور میرے دونوں کے دل دھڑکتے رہے کہ اس دور افتادہ مقام میں مدعوین کا آنا مشکل ہے، اس لیے جشن کامیاب نہ ہو سکے گا، میری صحت اچھی نہیں رہتی ہے، لیکن میں نے جشن کو کامیاب بنانے میں جان کی بازی لگا دی، یہاں اس شہر میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں ہے، جہاں معزز بیرونی مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا جا سکتا تھا، نائب صدر جمہوریہ کے لیے بھی کوئی موزوں جگہ نہ تھی، لیکن کافی خرچ کر کے بہتر سے بہتر خیمہ و خرگاہ شبلی کالج کے میدان میں نصب کیے گئے، پنڈال بھی خوبصورت تیار کیا گیا، ایک روز پہلے

دار المصنفین کو آراستہ و پیراستہ کر کے دلہن بنا دیا گیا، جو طرح طرح کی روشنی سے جگمگانے لگا، پھر بھی ڈر تھا کہ مدعوئین نہ پہنچے تو خفت اور مالی زیر باری دونوں ہوگی، لیکن ذاکر صاحب کا اقبال روز افزوں عروج پر تھا، اس لیے ان کی آمد میں دار المصنفین پر بھی اقبال طاری ہوا، بیگم صاحبہ بھوپال کا تار پہنچا کہ وہ بھی تشریف لائیں گی، اترپردیش کی چیف منسٹر مسز سچیتا کرپلانی کا ٹیلیفون آیا کہ وہ بھی آرہی ہیں، جناب ہمایوں کبیر وزیر حکومت ہند، سفیر شام، سفیر سعودی عرب الشیخ احمد الشبیلی، جناب افضل اقبال صاحب ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی طرف سے بھی اطلاع ملی کہ وہ بھی شرکت کرینگے، پھر جناب علی ظہیر صاحب وزیر قانون و انصاف حکومت اترپردیش، جناب مظفر حسن وزیر حکومت اترپردیش، پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ، ڈاکٹر عابد حسین دہلی، کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا طیب مہتمم دار العلوم دیوبند، ڈاکٹر یوسف حسین پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی، مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی، مفتی عتیق الرحمٰن دہلی، مولانا اسعد میاں ناظم جمعیۃ العلمائے ہند، مولانا منت اللہ امیر شریعت بہار، مولانا شاہ عون احمد صاحب خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، مولانا قاضی محمد سجاد صاحب صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی، جناب مالک رام دہلی، جناب حیات اللہ انصاری صاحب ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ، جناب رضا انصاری صاحب فرنگی محل لکھنؤ، پروفیسر حسن عسکری صاحب پٹنہ یونیورسٹی، مولانا عرشی صاحب رامپوری، ڈاکٹر امیر حسن عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی، جگن ناتھ آزاد دہلی، پروفیسر رام کمار چوبے بنارس، ضیاء الحسن فاروقی صاحب دہلی، جناب رونق صدیقی صاحب، جناب عدیل عباسی صاحب بستی، جناب نیاز احمد صدیقی سابق پرنسپل محمد حسین انٹر کالج جونپور، محمد یٰسین خان صاحب جونپور، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی بمبئی، مولوی ریاست علی ندوی پٹنہ، پروفیسر عبد القوی دسنوی بھوپال، وغیرہ شریک ہو کر رونق مجلس ہوئے، دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بیرونی ارکین میں ڈاکٹر سید محمود، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب ندوی، ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی، سید شہاب الدین دسنوی بمبئی، ظہور الحسن صاحب آئی، اے، ایس سابق سکریٹری یو، پی حکومت، مولانا اویس نگرامی ندوی اور جناب سعید انصاری جامعہ ملیہ دہلی بھی آگئے تھے، ۲۱ فروری کو دار المصنفین اس کے کارکنوں کی آرزوؤں کی جنت بن گئی، اس میں

معزز مہمان فرشتوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آئے، جب ذاکر صاحب دار المصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کو ساتھ لیکر جلوہ افروز ہوئے ہیں، انکا شاندار استقبال کیا گیا، شبلی کالج کے ان۔سی۔سی نے گارڈ آف آنر دیا، دار المصنفین کے احاطہ میں سب ان کے لیے فرش راہ ہو گئے، میں اس منظر کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا، اور اس تقریب کی شوکت سے میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہنے لگے۔ ذاکر صاحب نے تھپکی دی اور بولے "آپنے تو ایک شہر آباد کر دیا ہے، اتنی تیاری کی ضرورت نہیں تھی، جوبلی منانے کا مقصد، روپیہ کمانا بھی ہوتا ہے، کہیں مالی خسارہ نہ ہو" پھر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "خسارہ میں نہیں رہیئے گا، کچھ تحفے لایا ہوں" میں نے عرض کیا کہ "آپ کا آجانا ہی سب سے بڑی دولت ہے" بولے "میری فکر نہ کیجئے، میں دار المصنفین کو اپنا گھر سمجھکر آیا ہوں، مسز سہگل کرپلانی اور بیگم صاحبہ بھوپال کی ہر ممکن خاطر تواضع کیجیے"۔

لنچ کے بعد ذاکر صاحب نے تھوڑی دیر تک آرام کیا، پھر تین بجے سہ پہر کو جشن کا جلسہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کی صدارت میں شروع ہوا، ذاکر صاحب جب ڈائس پر آکر بیٹھے تو مجھکو وہ بہت ہی دل آویز اور پرشکوہ معلوم ہوئے، خیال ہوا کہ یونان میں افلاطون شاید اسی طرح لوگوں کی نگاہوں میں دکھائی دیتا ہو، جناب شاہ معین الدین صاحب نے جب انکی خدمت میں سپاسنامہ پڑھا تو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بھی انکی نذر کر رہے ہیں، انھوں نے سپاسنامہ کی ابتدا اس طرح کی :

جناب والا !

آپ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی و علمی ادارے دیکھے ہیں، خود انکے مہمان ہوئے ہیں، اور ان کے فضلا کو اپنا مہمان بنایا ہے، بڑے بڑے سلاطین اور حکومتوں کو آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ کی آنکھوں نے شاہانہ استقبال و میزبانی کے پرشکوہ مظاہر دیکھے ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ہم بوریہ نشینوں کے پاس نہیں ہے لیکن آپ کی بڑائی ان ظواہر سے بے نیاز ہے اور آپ کا دل بھی

ان سے سیر ہے، ہمارے پاس صرف اخلاص کا ہدیہ، سادگی کی پونجی ہے جس کے آپ خود بڑے قدر شناس ہیں، اسلیے ہم کو یقین ہے کہ ہمارا ہدیۂ اخلاص آپ کی نگاہ میں شان وشکوہ کے مظاہرے سے زیادہ قابل قبول ہوگا، ہمارے لیے آپ کی حیثیت تنہا ہندوستان کے وائس پریسیڈنٹ ہی کی نہیں، بلکہ ایک مفکر، ایک ماہر تعلیم اور معمار قوم کی بھی ہے، آپنے اس زمانہ میں نوجوانوں کو ملک و ملت کے لیے ایثار و قربانی کا عملی سبق دیا جب ان کا منتہائے نظر سرکاری عہدے اور دنیاوی دولت و وجاہت تھی، آپنے انکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کر کے قومی تعلیم کا ایک عظیم الشان ادارہ قائم کر دیا جس نے انگریزوں کی غلامی کے دور میں ملک کے نوجوانوں کو درد دیا اور ان کو قوم وملت کی راہ پر لگا دیا، آپنے مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے مسلم یونیورسٹی کو بڑے نازک دور میں تباہی سے بچا کر دوبارہ زندگی بخشی، اب آپ کی ذاتی عظمت دنیاوی اعزاز سے بے نیاز ہے، آپ کے جمال و کمال کو ظاہری زینت و آرائش کی ضرورت نہیں ہے، ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

لیکن اللہ تعالیٰ ایثار و قربانی کا صلہ ضرور دیتا ہے، اس لیے اب آپ کو ان دنیاوی انعامات سے بھی نوازا جن کی ایک بڑے سے بڑا ہندوستانی تمنا کر سکتا ہے، اگرچہ جوہر دار تلوار کے لیے طلائی قبضہ کی ضرورت نہیں لیکن طلائی قبضہ اس پر زیب دیتا ہے، اسی طرح آپ کی کلاہ عظمت پر آپ کے جلیل القدر عہدے کا طرہ بھی زیب دیتا ہے"۔

"دار المصنفین سے جناب کے جو گوناگوں تعلقات ہیں، ان کے اظہار کی ضرورت نہیں، ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر تھے، گو راہیں جدا جدا تھیں، اس وحدت مذاق نے جو رشتہ ہمارے درمیان پیدا کر دیا تھا، وہ بحمد اللہ ہر زمانہ میں قائم رہا، دار المصنفین کی مجلس منتظمہ کو آج بھی آپ کی رکنیت کا شرف حاصل ہے، اس رشتہ کی کشش تھی جو آپ کو اعظم گڈھ کھینچ لائی، ورنہ اس ویرانہ میں ہندوستان

کے نائب صدر جمہوریہ کا ورود کون تصور کر سکتا تھا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

یہ سپاسنامہ رسمی طور پر نہیں بلکہ بہت ہی عقیدت و اخلاص سے پیش کیا گیا تھا، اس لیے ذاکر صاحب نے بھی لطف و لذت کے ساتھ سنا اور خود بھی بہت محبت و اخلاص سے اپنا خطبہ پڑھ کر سنایا، جس میں انھوں نے فرمایا:۔

جناب صدر، بزرگو اور دوستو!

زبان اور اسکا ذخیرۂ الفاظ یوں بھی قلب انسانی کی صحیح اور مکمل ترجمانی سے قاصر تھا، اور پھر زبان کے سرمایہ داروں نے اپنا سارا خزانہ سطحی جذبات کی نمود و نمایش میں اس بے دردی سے لٹا دیا کہ گہرے محسوسات کے لیے اچھوتے الفاظ باقی نہیں رہے، مجبوراً ہمیں گہرے اور نازک سے نازک وارداتِ قلب کو بیان کرنے کے لیے ان ہی گھسے پٹے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے جن میں اب بظاہر نہ آب رنگ رہا ہے نہ معنویت، اسی لیے اگر میں یہ کہوں کہ دار المصنفین کے جشن طلائی میں شرکت کرنا میرے لیے فخر و مسرت کا باعث ہے، تو آپ قیل کی فرسودگی اور بے رنگی پر نہ جائیے، بلکہ اس کی تہہ میں قائل کے جوش و خلوص کی تازگی و تب و تاب کو دیکھئے، اور محسوس کیجئے، جی ہاں، مجھے آج فخر ہے اس پر کہ پچھلی نصف صدی میں ہمارے ملک میں سیاست کی تند و تیز آندھیوں کے درمیان میں تحقیق و تخلیق کے چراغ جلتے رہے، اور علم و ادب کی جوت جگاتے رہے اور مسرت ہو رہی ہے کہ ان میں سے ایک سراجِ منیر دار المصنفین اعظم گڈھ ہے، جس کے ساتھ مجھے کئی رشتوں سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لیے کہ یہ یادگار ہے، میرے محترم بزرگ مولانا شبلی نعمانی اور انکے شاگردانِ رشید مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبد السلام ندوی مرحومین کی، اور کارنامہ ہے میرے محترم اور شفیق بھائی مولوی مسعود علی ندوی اور عزیز دوست شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولوی سید صباح الدین عبد الرحمن

اور ان کے رفقائے کار کا، اور اس لیے کہ اس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جس کی خدمت میں میں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گذارا ہے، ہم خیالی اور ہم مشربی کا تعلق رہا ہے، ان ذاتی تعلقات سے قطع نظر ایک مسلمان اور ہندوستانی کی حیثیت سے مجھے یہ ادارہ جو قوم کی بیش بہا دولت ہے، دل سے عزیز ہے، اور اسکے جشن میں شرکت کرکے سچی خوشی محسوس ہوتی ہے"۔

ذاکر صاحب بڑے اچھے خطیب بھی تھے، ان کا شمار ملک کے بہترین خطیبوں میں ہوتا ہے، اپنی خطابت میں زور و فروغ الفاظ یا جملوں کا سہارا نہیں لیتے، بلکہ جو کچھ کہتے ایسے سادہ، مخلصانہ مگر دل آویز انداز میں کہتے کہ معلوم ہوتا کہ اس سے بہتر طریقہ پر وہ چیز ادا نہیں کی جاسکتی ہے، ان کی تحریروں میں بھی اسی سادگی کی دل آویزی ہوتی تھی، لیکن وہ اپنی اثر پذیری کی وجہ سے ایک خاص اسلوب بن جاتا، جو انشا پردازی کے ٹکڑے بھی بن جاتے، ان کا مذکورہ بالا خطبہ ان کی اسی سادہ خطابت اور انشا پردازی کا ایک نمونہ ہے، وہ دار المصنفین کے جشن جوبلی میں اپنی شرکت کی خوشی کا اظہار کر چکے تو نہ صرف اپنے سامعین بلکہ پورے ہندوستان کو دار المصنفین کی طرف ہمدردانہ توجہ کرنے کی ضرورت پر زور یہ کہہ کر دیا

"آج اس مبارک موقع پر جب دار المصنفین اعظم گڈھ اپنی زندگی کی پہلی نصف صدی پوری کرکے نصف دوم میں قدم رکھ رہا ہے، سب علم دوست اور محب وطن ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کا فرض ہے اور ہم آپ جو ملک کے مختلف حصوں سے آکر یہاں جمع ہوئے ہیں، اسے ساری قوم کی طرف سے یہ فرض کفایہ کے طور پر ادا کر رہے ہیں کہ دار المصنفین اور اس کے مؤسس روحانی مولانا شبلی نعمانی کی گرانقدر علمی اور ادبی خدمات کا جس سے انھوں نے بلا واسطہ ہندوستان کے اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا اور ان کی ان ملی خدمات کا جن سے انھوں نے حب وطن، آزادی اور قومی یکجہتی کی تحریکوں کو سہارا دیا، کم سے کم ایک سرسری جائزہ لیں، ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کریں اور سوچیں کہ اس چشمۂ فیض کو جاری رکھنے اور اسکے دامن کو وسیع کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔

اس کے بعد انھوں نے دار المصنفین کے کارناموں پر مختصر لیکن پرمغز طریقہ پر مداحانہ تبصرہ کیا:

"علامہ شبلی اور دار المصنفین کا علمی اور ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ و سیر، تاریخ ہند اور تاریخ و تنقید ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی خصوصیات میں نفس مضمون کی متنوعیت، لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اور اُن سے بھی زیادہ نمایاں قلب و نظر کی وسعت ہے، اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے، اور "قصۂ سکندر و دارا" افسانے پر "حکایت مہر و وفا" بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔"

اس خطبہ کے لکھنے تک ہندوستان کے قرون وسطیٰ پر دار المصنفین سے سولہ[16] جلدیں نکل چکی تھیں جو ذاکر صاحب کی نظروں سے گذری تھیں، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندوستان میں تاریخ نگاری کے اس تاریک دور میں جب ہمارے اکثر مورخ اپنے مجازی استادوں کے کہے ہوئے کو طوطی صفت دہرا دیا کرتے تھے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان کو ایک بحر طوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے، جس میں اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کے دھارے ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے رہتے تھے، دار المصنفین کے مورخوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کا ملنا تصادم نہیں بلکہ امتزاج، سنگھرش نہیں بلکہ سنگم تھا، اور کیوں نہ ہو عالمی تاریخ کی تہ کو پہنچیے تو ہر تہذیب ایک عظیم الشان منصوبہ کی تکمیل میں اپنا اپنا حصہ پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔"

ذاکر صاحب کا خاص موضوع تو معاشیات تھا، لیکن مختلف علوم و فنون کا مطالعہ بھی برابر کرتے رہے، جس سے ان کی فکر و نظر میں ہمہ گیریت تھی، اس لیے وہ ہر موضوع پر گہری نظر ڈال کر اس میں خاص آب و تاب پیدا کر دیتے تھے، چنانچہ اپنے اس خطبہ میں بھی یہ کہکر ناصحانہ اور مفکرانہ رنگ پیدا کر دیا:

"لین دین، تاثیر و تاثر کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ایک صالح انسانیت کی تعمیر کے لیے برابر جاری ہے، علوم و فنون کا خزانہ ہندوستان سے بغداد پہنچا، وہاں عربوں نے اس پر اپنی زبان اور تہذیب کا رنگ چڑھایا، چند صدیوں بعد یہی علوم و فنون ترکوں کے ذریعہ پھر ہندوستان واپس آئے اور اس ملک کی تہذیبی زندگی کو مالا مال کیا، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ایک وسیع تر تاریخ کا جز بن گئی، اس کا احساس وضاحت کے ساتھ امیر خسرو کے یہاں خصوصاً ان کی مثنوی نہ سپہر میں ملتا ہے، صرف یہی نہیں کہ حضرت امیر خسرو نے ہندوستانی اشیاء سے متعلق اپنی گہری پسند کا اظہار فرمایا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سارے ہندوستانی تاریخی ورثے کو اپنا ورثہ سمجھتے ہیں، اس پرانے عہد کی تمام زندگی میں یہ احساس موجود تھا، خسرو نے شاعر کی حیثیت سے اس احساس کو آب و تاب کے ساتھ پیش کر کے جامعی زندگی اور احساس کی سچی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔"

ذاکر صاحب اپنی قابلیت اور ذہانت سے اپنی تحریروں کو موم کے سانچے کی طرح اپنی خواہش کے مطابق موڑ کر ان میں پیچ و خم پیدا کر دیتے تھے جس میں بڑی نکتہ رسی بھی ہوتی اور گہری بصیرت بھی۔ امیر خسرو کے احساس وطنیت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

"اسلام کا نقطۂ نظر چونکہ عالمی نقطۂ نظر ہے، اس کا خطاب چونکہ ساری نوع انسانی سے ہے، اس لیے اس کی تعلیمات سے متاثر مورخوں سے امید کی جا سکتی ہے کہ تاریخ نگاری کو تنگ تعصبات کے بھلانے کا ذریعہ نہ بنائیں گے بلکہ انسان کو اس تقدیر سے آگاہ کرنے میں مدد دیں گے، شاید امام شافعی کا قول ہے کہ اگر صرف سورہ والعصر نازل کر دی جاتی تو بندوں کو ہدایت کے لیے کافی تھا، اس قول میں بڑی بصیرت پوشیدہ دکھائی دیتی ہے، اس لیے کہ اس مختصر سی سورت کے چند بولوں میں تاریخ عالم کی نہایت بلیغ توجیہ و تعبیر موجود ہے، ذکر وہی عموم کے ساتھ انسان کا ہے اور زمانہ کی قسم سے منشا یہ ظاہر کرنا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ انسان کے لیے جبری لزوم کی زنجیریں نہیں بناتا بلکہ عمل کے لیے بے شمار امکانات

دروازہ کھول دیتا ہے، یہ تاریخ کی اخلاقی توجیہ ہے، اس سے تاریخ انسانی اعمال کے نتائج سے عبارت ہو جاتی ہے، جو انسانی یقین اور ارادہ سے ظہور میں آتے ہیں، اور کیسا بلیغ اشارہ ہے کہ اگر فوری طور پر نیک عمل کرنے والی جماعت گھاٹے میں نظر آئے تو صبر کے ساتھ انتظار کرے، زمانہ اس گھاٹے اور نامرادی کو کامیابی میں بدل دیگا، بے یقینی اور بے عملی کے لیے تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔"

ذاکر صاحب نے سورہ والعصر کی دل آویز تشریح کر کے جس پوشیدہ مذہبی، تاریخی اور انسانی بصیرت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ نہ صرف ہندوستان کے مورخوں بلکہ انسانی معرفت کے اقدار کے قدردانوں کے لیے ایک مستقل پیام ہے۔

ذاکر صاحب نے اپنے خطبہ کا رخ موڑ کر پھر دار المصنفین کی گوناگوں خدمات کا ذکر چھیڑ دیا اور فرمایا:

"دار المصنفین نے تاریخی تحقیق پر خاص توجہ کر کے اسلامی اور ہندوستانی تہذیبی زندگی اور اُن کی معرفت انسانی اقدار کی بڑی خدمت انجام دی ہے، ملکی سیاست کے میدان سے دار المصنفین کو بہ حیثیت ایک علمی اور ادبی ادارے کے کوئی تعلق نہیں رہا، لیکن شخصی حیثیت سے اس کے مراد و مرشد مولانا شبلی سچے اور پکے قوم پرور مسلمان تھے، اور اس کے کارساز و کارپرداز مولوی مسعود علی ندوی بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے رہے اور دونوں نے اتحاد اور آزادی کا ساتھ دیا، اور تفریق اور غلامی کے رجحانات کی شدید مخالفت کی، اس لیے دار المصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں میں قومی آزادی اور قومی یکجہتی کے جذبات روح رواں کی طرح سما گئے، اور ان کی تائید، ہمدردی، اتحاد اور آزادی کے سب علمبرداروں خصوصاً قوم پرور مسلمانوں کے لیے قوت اور فیضان کے سرچشمے کا کام دیتی رہی۔"

اور پھر بڑی دل سوزی سے اپنی اور ملک کی طرف سے دار المصنفین کے لیے دعائیں کرتے ہوئے ان سطروں میں خراج تحسین پیش کیا جس میں دار المصنفین کو ایک سربلند سایہ دار برومند درخت اور شجر طیبہ کہا

"اگر میں یہ سمجھوں تو بیجا نہ ہوگا کہ علم و ادب کے قدرشناس اور ملک و قوم کے خیرخواہ وہ بھی جو آج

یہاں موجود اور اس مجلس میں شریک ہیں اور وہ بھی جو اپنی مجبوریوں کی بنا پر شرکت سے محروم رہے، میری طرح یہ احساس رکھتے ہیں کہ دار المصنفین اعظم گڈھ کا ہندوستان کی تہذیب و تاریخ تدوین اور آزادی و یکجہتی کی تحریک میں قابل قدر اور قابل ذکر حصہ ہے، اور میرے ہم زبان ہو کر اس کے گذشتہ اور موجودہ اراکین کا ان کی بیش بہا خدمات کے لیے پرجوش شکریہ ادا کرتے ہیں، اور انھیں پرخلوص مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ پودا جو انھوں نے اب سے پچاس برس پہلے لگا کر اسے اپنے خون سے سینچا تھا، آج ایک سربلند اور برومند درخت بن گیا ہے، اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اس شجر طیبہ کی جڑیں اور زیادہ مضبوط ہوں اور اسکی شاخیں اور پھیلیں، اس کے پھولوں کی شادابی اور نکہت اور اس کے پھلوں کے رس اور لذت میں اور اضافہ ہو۔"

ذاکر صاحب کو یہ معلوم تھا کہ اس سایہ دار برومند درخت اور شجر طیبہ کے سینچنے میں اس کے باغبان کٹھن منزلوں سے ابتک گذر رہے ہیں، اور وہ ابھی تک اسی قناعت و توکل کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو خود انھوں نے جامعہ ملیہ میں گذاری تھی، اسی لیے اس کی طرف بہت ہی حسین پیرایۂ بیان میں قوم و ملک کی توجہ دلائی،

"مگر دار المصنفین کے قدردانوں، معترفوں اور شکر گذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے کہ قدردانی، تعریف اور شکر گذاری اپنی جگہ بہت اچھی چیزیں ہیں، لیکن ان سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہے، نہ بھاپ بنتی ہے، نہ گاڑی چلتی ہے، اس عالم مادی میں ذہنی اور روحانی کاموں کے لیے بھی مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ہم آپ واقعی دار المصنفین کے قیام کو علم و ادب اور ملک و قوم کے لیے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے اور یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض ذاتی ہے کہ قدمے اور سخنے سے آگے بڑھ کر دامے درمے اس کی مدد دل کھول کر کریں، مجھے امید ہے کہ ارباب علم و دانش زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی مطبوعات کے مستقل خریدار بنیں گے، اور ارباب حکومت و اقتدار کو اس پر آمادہ کرینگے

کہ انھیں مدرسوں کے کتب خانوں اور عام کتب خانوں کے لیے خریدیں، یہ کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ ایک اچھا سودا جس میں چاندی کے چند ٹکڑوں بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم و حکمت کی دولت ہاتھ آتی ہے، جو بے بہا اور لازوال ہے۔"

ذاکر صاحب نے دار المصنفین کے حقوق کی وکالت کرنے کے بعد ایک مخلص بزرگ، ایک وطن پرست اور ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے اس ادارہ کو اس کے فرائض سے بھی آگاہ کیا، ناظرین کو حسب ذیل اقتباسات میں فلسفیانہ فکر، مورخانہ نظر، ثقافتی بصیرت اور ایک مخلص رہنما کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ادب و انشاء کی چاشنی اور لذت بھی محسوس ہوگی۔

"آخر میں چند الفاظ دار المصنفین کے اراکین اور رفیقوں سے کہنا چاہتا ہوں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے آپ کی تصنیف و تالیف کا ایک خاص میدان ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ اور اس کی ایک امتیازی خصوصیت قلب و نظر کی وسعت ہے یعنی مختلف تہذیبوں اور معاشروں کی مثبت اور موثر اقدار کا اعتراف کرنا، ان کے اختلافات میں اشتراک اور اتحاد کے نقطے تلاش کرکے انھیں نمایاں کرنا، آپ کی یہ خصوصیت ہمارے دور محکومی میں جب تاریخ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت مسخ کی جارہی تھی، بہت کام آئی لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ اس دور آزادی میں تاریخ کو تفرقی سیاست کا آلہ کار بنانا ختم ہو چکا ہے، آج بھی یہی رجحان باقی ہے اور خاصا قوی ہے، آج بھی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی، جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے، اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام اور آپ کا کام ابھی ادھورا ہے، آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جدوجہد کرنی ہے تاکہ تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرون وسطی میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے، لیکن ان میں ایک مشترک قلمرو بھی تھا، جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا، میرا

یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاریخ سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اسکے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، میرا یہ پختہ خیال ہے جسے تاریخی نظریہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ صرف ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیبوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، بلکہ وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں، انسان کا وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے، اس میں سے تہذیب کے چند ہزار سال نکال دیکھئے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا زمانہ تھا، اس لیے آج اُن افراد اور قوموں میں جنھیں ہم تہذیب کہتے ہیں، تہذیب کی ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانے کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوئی ہیں جو موقع ملنے پر ابھر آتی ہیں، دو قوموں کی تہذیبیں جب تک اپنی اپنی وحشتوں کو دبائے ہوئے ہیں، آپس میں لڑتی نہیں بلکہ گلے ملتی ہیں اور تہذیبی قدروں کا لین دین کرتی ہیں، مگر جب انکی وحشتیں انکی تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں تو ایک تہذیب دوسری تہذیب سے بھڑ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو نوچنے کاٹنے اور بھنبھوڑنے لگتی ہیں۔"

ان کے خطبہ کے آخری ٹکڑے میں بڑی مخلصانہ اور ہمدردانہ اپیل تھی، جو نہ صرف دار المصنفین کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے اہل علم کے لیے ہے:

"آپ سے میری یہ التجا ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لیے چھوڑ دیجئے، آپ تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں وہ ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے اور اپنے محبوب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹائیے جس کے صدر دروازہ پر حالی کی یہ رباعی رقم ہو:

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں

دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ان چند لفظوں کے بعد جنھیں کسی مہمان خصوصی کا رسمی خطبہ نہیں بلکہ ایک محب مخلص کے دل کی آواز سمجھیے، میں دار المصنفین اعظم گڈھ کے جشن طلائی کا افتتاح کرتا ہوں۔"

یہ خطبہ بار بار تالیوں کی گونج سے سراہا گیا، اور جب یہ ختم ہوا تو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا کہ یہ تمام خطبات کا تاج محل ہے، اس کا یہ فقرہ ہر شخص کی زبان پر تھا

"تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتی ہیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں۔"

ذاکر صاحب نے اس افتتاحیہ اجلاس میں دار المصنفین کے لیے اپنی حکومت کی طرف سے پچاس ہزار کے عطیہ کا بھی اعلان کیا، اسی کے ساتھ ان کے عزیز دوست کرنل بشیر حسین زیدی نے سیدنا سیف الدین طاہر کی طرف سے بارہ ہزار، جناب مصطفےٰ رشید شروانی کی طرف سے تین ہزار، اور حکیم عبد الحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی کی جانب سے ایک ہزار کے چیک پیش کیے جو ذاکر صاحب کی خواہش ہی پر حاصل کیے گئے تھے، پھر ان ہی کی موجودگی میں مسز سچیتا کرپلانی نے حکومت اتر پردیش کی طرف سے دس ہزار کی گرانٹ کا اعلان کیا، بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی دس ہزار روپیے کا عطیہ دیا، سعودی عرب کے سفیر محترم نے رابطۂ اسلامیہ کی طرف سے پانچ ہزار کی رقم کا اعلان کیا، دس ہزار کی گرانٹ حکومت کشمیر کی طرف سے بھی ملی، اس سے پہلے طلائی جوبلی کے سلسلہ میں بھوپال میں مولانا عمران خاں صاحب ندوی نے ایک ایک ہزار کے بارہ لائف ممبر بنائے تھے، جناب سیٹھ عبد العزیز انصاری اور سید شہاب الدین دیسنوی صاحب نے اپنی مساعی جمیلہ سے بمبئی میں ایک ایک ہزار کے چالیس ممبر بنا کر اس ادارہ کو غیر معمولی امداد پہنچائی، اسی موقع پر پاکستان کی طرف سے پچیس ہزار کی کتابوں کی خریداری کا اعلان ہوا، دو ہزار روپے کویت سے جناب ڈاکٹر عبد اللطیف نے اس جشن کے لیے بھیجے، پھر ڈاکٹر

حمید اللہ نے فرانس سے ایک ہزار روپیے کا عطیہ بھیجا، اس طرح ذاکر صاحب کے قدموں کی برکت سے دار المصنفین کو تقریباً ایک لاکھ اکاسی ہزار کی امداد پہنچ گئی۔

جوبلی کے افتتاحیہ اجلاس کے بعد مسز سچیتا کرپلانی کو راقم نے ایک سپاسنامہ پیش کیا جس میں ذاکر صاحب بھی سامعین کی حیثیت سے شریک رہے، پھر شبلی منزل کے لان پر ایٹ ہوم ہوا، ذاکر صاحب مسز سچیتا کرپلانی، بیگم صاحبہ بھوپال، سفراء اور وزراء کو دیکھنے کے لیے اتنا ہجوم ہو گیا تھا کہ ان کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، لیکن ضلع کے کلکٹر شری ماڈول اور ایس، پی شری بھلا نے بڑی خوش اسلوبی سے مجمع کو قابو میں رکھا، ذاکر صاحب ان تقریبوں میں سب سے بہت ہی بے تکلفی سے ملے، کہیں سے ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ نائب صدر ہیں، اعظم گڈھ کے ان لوگوں سے بھی ملے جنھوں نے تقریباً چالیس برس پہلے جامعہ ملیہ کو ان کے یہاں آنے پر چندہ دیا تھا، ایٹ ہوم کے بعد وہ اپنے خیمہ میں چلے گئے، لیکن مغرب کی اذان ہوئی تو شبلی منزل کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کو آئے، وہ وہاں اس وقت پہنچے جب مسجد بھر چکی تھی، ان کو تقریباً نعلین کے پاس جگہ ملی اور اس جشن کا محمود ایاز کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز ادا کر رہا تھا۔

رات کو ایک سمپوزیم تھا جس میں سعودی عرب کے سفیر، مولانا طیب مہتمم دیوبند، ڈاکٹر یوسف حسین پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی تقریریں تھیں، ان تقریروں میں رات کافی گذرتی جا رہی تھی، ذاکر صاحب کے آرام کی خاطر میں بار بار ان سے کہتا تھا کہ وہ اٹھ کر تشریف لے جائیں، لیکن وہ فرماتے کہ میں ان تقریروں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، اور وہ آخر تک بیٹھے رہے، بہت رات گئے اپنے خیمہ میں سونے گئے، رات کے تین بجے ہوں گے کہ سخت آندھی آئی، میری آنکھ کھلی تو خیال آیا کہ ذاکر صاحب کا خیمہ گر گیا ہوگا، ایک صاحب دوڑے آئے اور بولے کہ ذاکر صاحب کا خیمہ گر گیا، اور وہ غسل خانہ میں پناہ لیے ہوئے ہیں،

میں بیحد مضطرب ہوا کہ ساری محنت ضائع گئی، دوڑ کر خیمہ کے پاس پہنچا، اس کا ایک ستون تو ضرور جھک گیا تھا، لیکن خیمہ محفوظ تھا، اندر سے ذاکر صاحب کی کوئی آواز نہیں آئی، تو میں نے اندر جانا پسند نہیں کیا، صبح ہوئی تو مضطربانہ طور پر ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا، بولے کہ مجھکو آندھی کی تو خبر بھی نہیں ہوئی اور میں بالکل غافل سویا، یہ محض ان کے اقبال کی کرامت تھی۔

صبح کو بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں جناب شاہ معین الدین صاحب نے ایک سپاسنامہ پیش کیا، ذاکر صاحب نے اس میں بھی شرکت فرمائی، اسی کے بعد ایک ادبی نشست تھی جس میں مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، ضیاء الحسن فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ کالج نے اپنے اپنے مقالے پڑھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقالہ مولانا شبلی پر تھا، جس کو نہ صرف عام حاضرین بلکہ خود ذاکر صاحب نے بہت پسند کیا، اور مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس کی داد دی، ان کی روانگی اسی دن کے سہ پہر کو تھی، اسلیے میں اس نشست کے آخر میں شکریہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا، اس جشن کی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور ان ہی آنسوؤں کی لڑیوں میں مشکل سے یہ کہہ پایا کہ میری زندگی کی تمنائیں یہ تھیں کہ مصنف بنوں، مولانا سید سلیمان ندوی کا شاگرد بن کر دارالمصنفین کا ادنیٰ خدمتگذار بنا رہوں اور دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کا جشن اپنے محترم بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں انجام دوں، یہ ساری تمنائیں پوری ہوگئیں، اگر ذاکر صاحب اپنے ہوائی اڈے پر پہنچ کر میری وفات کی خبر سنیں تو وہ میرے لیے کوئی غم نہ کریں۔

ذاکر صاحب کے جانے کے بعد رات کو ایک مشاعرہ بھی آنند نرائن ملا کی صدارت میں ہوا جس میں روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد، حبیب احمد صدیقی، عارف عباسی اور کوثر فاروقی وغیرہ جیسے منتخب شعراء شریک ہوئے، دوسرے دن صبح کو تمام مہمان رخصت ہوگئے، اس جشن میں کچھ مہمانوں کو ضرور تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن جتنے آئے، وہ سب دارالمصنفین کے مخلص اور قدردان تھے، اس لیے کسی نے

کوئی شکایت نہیں کی، شاہ معین الدین صاحب اور ہم دونوں بے انتہا خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی آبرو رکھ لی، اس جشن کو ہر طرح کامیاب کیا، یہ ذاکر صاحب کی محبت و اخلاص کا بھی نتیجہ تھا جو ان کو دارالمصنفین سے ہر زمانہ میں رہا، جشن کے دوسرے دن کے لنچ میں ایک بیرونی مہمان نے ذاکر صاحب کی موجودگی میں کہا کہ یہ جوبلی جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی ہی کے مقابلہ کی ہے، کرنل بشیر حسین زیدی نے سنکر فرمایا، جی نہیں، اس سے بہت بڑھی ہوئی، جامعہ کی سلور جوبلی جب ہوئی تھی تو میں رامپور کا وزیر اعلیٰ تھا، میں نے ریاست کا سارا سامان وہاں بھجوا دیا تھا، حتی کہ وہاں کے بہشتی اور بھنگی بھی گئے تھے، لیکن دارالمصنفین کے قناعت پسند بوریا نشینوں کی طرف سے جوبلی کی اس آرائش و زیبائش کو دیکھ کر میں خود متحیر ہوں، وہ ہر طرح کی تعریف کے مستحق ہیں،

ذاکر صاحب گلابوں کے بڑے عاشق زار تھے، اس لیے جوبلی کے جشن کے موقع پر گلابوں کے پھولوں کی بھی ایک نمائش کا انتظام کیا گیا تھا، یہ اہتمام محبی خلیل الرب صاحب (انسپکٹر آف اسکولز) نے کیا، ذاکر صاحب نے ان میں سے بعض گلابوں کو بہت پسند کیا، اور اپنے چمن کے لیے انکے پودے مانگے جو اکتوبر ۱۹۶۵ء ہی میں تیار ہوگئے، میں نے یہ پودے ان کے پاس بھیجے تو ایک مکتوب مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں تحریر فرمایا: "نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، گلاب کے ۱۲ پودے بھی پہنچے، کس طرح شکریہ ادا کروں، کسی اور تحفہ سے جی اتنا خوش نہیں ہوتا، جتنا اس سے ہوا، خلیل الرب صاحب کا بھی میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے۔"

ان کو گلابوں سے جو عشق رہا تو غیر شعوری طور پر وہ گلاب کی دل آویزی، رعنائی اور خوشبو زندگی کے ہر پہلو میں چاہتے تھے، اور وہ جہاں کہیں پاجاتے اس سے ایسے ہی خوش ہوتے جیسے اپنے چمن میں گلاب کی رنگینی اور خوبصورتی کو دیکھکر ہوتے۔

جوبلی کے جشن منانے کے چھ مہینے کے بعد یعنی ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کی جنگ چھڑ گئی، اس وقت سے ابتک ہند و پاکستان کا تجارتی لین دین بند ہے، اسلیے دارالمصنفین کی کتابوں کی تجارت کا توازن بالکل بگڑ گیا ہے، پاکستان کے بعض خود غرض ناشروں نے تجارتی لین دین بند ہونے کی وجہ سے اس کی

بہت سی کتابیں چھاپ لی ہیں جس سے اس پر مزید مالی ضرب کاری لگ رہی ہے، اگر اس کی جوبلی نہ ہوئی ہوتی اور ذاکر صاحب کے حسن وساطت سے اس کو عطیات نہ ملے ہوتے تو اس وقت تک معلوم نہیں یہ کن کن پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوتا، اس لحاظ سے بھی ذاکر صاحب اس کے بڑے محسن ہیں، ان سے جب جب ملاقات ہوئی تو اس کے مالی استحکام کی تدبیریں بتاتے رہتے، ان کا سہارا لے کر حکومت ہند سے اس کے لیے مستقل سالانہ امداد حاصل کرنا ممکن تھا، مولانا ابو الکلام آزاد کی خواہش بھی کہ یہ سالانہ گرانٹ منظور کرلے، کیونکہ انگریزوں کی طرح اب غیر ملکی حکومت نہیں ہے بلکہ قومی حکومت ہے، لیکن انکی خواہش کے باوجود سالانہ امداد لینا منظور نہیں کیا گیا، کیونکہ اسکے بعد ادارہ کے علمی مزاج کے بدل جانے کا خطرہ رہا،

فروری ۱۹۶۶ء میں ذاکر صاحب کے بھتیجے امتیاز حسین کا اچانک حیدرآباد میں انتقال ہو گیا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ جامعہ ملیہ کے قیام کے زمانہ میں میری ان سے گہری ملاقات ہو گئی تھی۔ ان کی وفات سے مجھکو بھی صدمہ ہوا، اور میں نے ایک تعزیتی خط ذاکر صاحب کو لکھا، جس کا جواب انھوں نے ۳ / مارچ ۱۹۶۶ء کو بہت ہی غمناک انداز میں اسی طرح دیا جس طرح ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کو دینا چاہئے:

"آپ کا تعزیت نامہ ملا، آپ کی ہمدردی کا دل سے شکر گذار ہوں، خدا کی مرضی یوں ہی تھی، اس پر صابر وشاکر ہونا چاہیے، یوں صدمہ میرے لیے سخت ہے اس لیے کہ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مرحوم کی پرورش میرے ہی ذمہ تھی، اور وہ مجھے بیٹے سے زیادہ عزیز تھے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا، راضی برضا ہوں"

ذاکر صاحب مئی ۱۹۶۷ء میں جمہوریۂ ہند کے صدر منتخب ہوئے تو دار المصنفین میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی، ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ہم لوگوں ہی میں سے صدر بنا ہے، اور ان کو اپنوں میں شمار کرنا سمجھ تھا کیونکہ وہ نہ صرف دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بہت ہی قدیم رکن تھے، بلکہ ہم لوگوں سے بزرگانہ تعلقات بھی رکھتے تھے، میں نے دار المصنفین کی طرف سے مبارکباد کے خط اور تار بھیجے اور

اسی کے بعد دار المصنفین کی تین نئی کتابیں بھی بھیجیں، اسکا جواب اپنے ایک عنایت نامہ مورخہ ۱ / جون ۱۹۶۷ء میں یہ دیا

محب مکرم! السلام علیکم

نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی اور دعاؤں کا شکریہ، دار المصنفین کے اراکین اور ملازمین کا بھی انکی دعاؤں کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں، خدا آپ سب کو خوش اور اچھا رکھے

آپ نے ازراہ نوازش جو تین کتابیں مجھے بھیجی ہیں وہ مجھے مل گئی ہیں، ان تصانیف کو میں دار المصنفین کے بیش بہا تحائف ہی سمجھتا ہوں، ان کتابوں کے لیے بھی شکریہ قبول فرمائیں، خدا کرے مزاج بخیر ہو۔ والسلام

میں نے اپنی طرف سے بھی ایک ذاتی خط لکھا تھا، اس کا جواب اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ / جون ۶۷ء میں اس طرح دیا:

محبی صباح الدین صاحب۔ السلام علیکم

"آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۱۰ / مئی ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، میرے صدر منتخب ہونے پر آپ نے جس خلوص اور محبت کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے دل سے شکر گذار ہوں، دعا فرمائیں کہ میں اپنے اس منصب کے فرائض کو پوری طرح انجام دے سکوں، اس سلسلہ میں مبارکباد کے خطوط اور تار اس کثرت سے آئے کہ ان سب کا جواب دینا جلد ممکن نہ ہو سکا، اس تاخیر کو معاف فرمائیے گا، شاہ معین الدین صاحب کو میرا اسلام مسنون پہنچا دیں۔"

میں اگست ۱۹۶۷ء میں ایک خاص کام کے لیے دہلی پہنچا، میری لڑکی عشرت افروز بھی ساتھ تھی، میں نے ذاکر صاحب سے وقت مانگا، تو مجھکو لڑکی کے ساتھ ملنے کو بلایا، جب میں راشٹرپتی بھون پہنچا تو ملاقات کے کمرہ کے دروازہ تک لینے کو آئے، اپنی شرافت طبع اور پاکیزگی اخلاق سے میری لڑکی سے اس طرح ملے جیسے اپنی خاص عزیزہ سے مل رہے ہوں، اس کو اپنی گفتگو میں برابر بیٹی کہکر مخاطب فرمایا، چائے آئی تو

اس سے مٹھائی اور پیسٹری کھانے کے لیے اصرار کیا، ان میں راشٹرپتی بھون کی فضا کی تمکنت اور وقار کے بجائے جامعہ ملیہ ہی کا عجز اور انکسار تھا، وہ کھدر کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، بعض لوگ کپڑے پہنکر خوبصورت اور بارونق معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذاکر صاحب کے جسم پر خود لباس خوبصورت اور بارونق بن جاتا، اعلیٰ قسم کے مغربی وضع کے ڈرائنگ روم میں ان کا مشرقی مزاج چھایا ہوا تھا، وہ خود ہی ڈرائنگ روم کی زینت بنے ہوئے تھے، ان سے باتیں کرنے میں راشٹرپتی بھون کے ماحول کو ان کے قدیم رنگ کی حسین وضعداری سے دبا پایا، صدر کی حیثیت سے ان سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی، میں نے کئی بار جلد اٹھنے کی کوشش کی لیکن اصرار سے روکے رکھا، دارالمصنفین کی مالی حالت پوچھی، وہ جانتے تھے کہ میری صحت اچھی نہیں رہتی ہے، اس لیے صحت کو برقرار رکھنے کی نصیحت فرمائی، پھر کہا کہ شاہ معین الدین صاحب اور آپ دونوں نے مل کر دارالمصنفین کے معیار اور حیثیت کو برقرار رکھا ہے لیکن آپ دونوں اپنے پیچھے کوئی جماعت نہیں چھوڑ رہے ہیں، میں نے عرض کیا، اب پہلے کی طرح ایثار پسند اور خدمت گذار نوجوان نہیں ملتے، فرمایا کہ ہندوستان سے ایثار اور خدمت کا جذبہ ختم ہوچکا ہے، پہلے ایثار و خدمت بڑا وصف سمجھا جاتا تھا لیکن وہ دور جاتا رہا، اس لیے ایثار پسند نوجوانوں کی تلاش فضول ہے، ان کو وہی تنخواہیں دے کر رکھئے جو ہر جگہ ملتی ہیں، اور پھر ہنستے ہوئے فرمایا کہ ادارہ چلانے میں یہ ضرور ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ پاؤں دیکھ کر چادر بنائی جائے، آپ لوگوں کو اب ایسی ہی چادر بنانی ہے، اسی سلسلہ میں فرمایا کہ اس زمانہ میں صرف جماعت اسلامی والے ہی ایثار اور قربانی سے کام لے رہے ہیں، میں نے ان کی مطبوعات میں سے محسن انسانیت پڑھی ہے، یہ مجھکو بہت پسند آئی، جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عرض کیا، آپ کی بدولت راشٹرپتی بھون کے اندر تک پہنچ گیا، اس کا جواب بڑی محبت سے یہ دیا، مگر آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت میں بھی راشٹرپتی بھون میں پہنچ گیا۔

وہاں سے آنے کے بعد میں ایک مرض میں مبتلا ہوگیا، جس کے اعظم گڈھ اور پٹنہ میں دو آپریشن ہوئے میں شفا پاکر پٹنہ سے اعظم گڈھ آیا تو کسی سلسلہ میں ان کو خط لکھا تو اپنی علالت کا بھی ذکر کردیا، اسکے جواب میں اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴ر جنوری ۱۹۶۱ء میں تحریر فرمایا کہ ”مجھکو آپ نے اپنی علالت کی خبر نہیں دی، میں آپ کے لیے کم از کم دعائیں تو کرسکتا تھا، خدا کرے آپ عرصہ دراز تک توانا اور تندرست رہ کر دارالمصنفین کی مفید خدمات انجام دیتے رہیں، آمین“۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں دہلی گیا تو کچھ ایسی عجلت میں تھا کہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا، اور ان سے ملے بغیر اعظم گڈھ واپس چلا آیا، تو ایسا معلوم ہوا کہ دہلی گیا ہی نہ تھا، یہاں آنے کے بعد دارالمصنفین کی پانچ مطبوعات کی جلدیں ان کی خدمت میں ارسال کیں اور دہلی جانے اور خدمت میں حاضر نہ ہونے کا افسوس بھی ظاہر کیا تو اس کا جواب ایک مکتوب مورخہ ۲۵ر اپریل ۶۸ء میں اس طرح دیا:-

مجی صباح الدین صاحب! السلام علیکم

نوازش نامہ مورخہ ۸ر اپریل بھی ملا اور دارالمصنفین کی پانچ مطبوعات بھی جو آپ نے ازراہ ذاکر نوازی بھیجی ہیں، بڑی خوشی ہوئی کہ اشاعت کتب کا کام قابل اطمینان طور پر بڑھ رہا ہے، انشاء اللہ آئندہ سال بھی ۵۔۶ کتابیں نکل جائیں گی، آپ لوگوں کی محنت اور آپ کا انہماک قابل رشک ہے،

یہ آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟ کہیں میرے دفتر سے تو وقت دینے میں کوتاہی نہیں ہوئی یا اس کوتاہی کے خیالی اندیشہ سے آپ نے وقت ہی نہیں چاہا، آپ دہلی آئیں اور ملاقات نہ ہو، یہ تو اچھا نہیں لگتا، سب ساتھیوں کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ والسلام۔ مخلص ذاکر حسین۔

اس مکتوب کے بعض فقروں میں دل نوازی کی کیسی شمیم انگیزی ہے، جس سے معلوم نہیں میری طرح کتنے مکتوب الیہ معطر ہوتے رہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں راشٹرپتی بھون میں نذرِ ذاکر کے نام سے دو جلدیں پیش کی گئیں، اس میں میرا بھی ایک مقالہ تھا، خلاف توقع ذاکر صاحب کا ایک مکتوب مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۹ء ملا، میرا خیال ہے کہ یہ ایک مشترک مکتوب ہے جو انھوں نے نذرِ ذاکر کے ہر مقالہ نگار کو لکھا تھا، یہ دلچسپ ہے، اور میرے نام ان کا آخری مکتوب ہے، اس لیے ذیل میں درج ہے:

تسلیم

مکرم بندہ!

یہ شکریہ کا ناچیز ہدیہ آپ کی خدمت میں بہت دیر سے پہنچ رہا ہے، جس کے لیے دل سے معذرت خواہ ہوں، آپ نے ازراہ ذاکر نوازی "نذرِ ذاکر" میں اپنا گراں قدر مضمون شامل فرماکر جو کرم فرمایا تھا اس کا دلی شکریہ تقریباً ایک سال بعد پیش خدمت کر رہا ہوں، یہ کتاب سال بھر سے پہلے میری سالگرہ کی تقریب میں دوستوں نے مجھے عنایت فرمائی تھی، عمر بھر اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی، لیکن اب دوستوں نے ایک صحیح یا غلط تاریخ کا تعین فرماکر اس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، کتاب جب ملی تو اسے پڑھنا شروع کیا، ایک دوست میری میز سے وہ نسخہ اٹھا لے گئے اور حسب معمول واپس کرنا بھول گئے، اور میں بھول گیا کہ وہ کون دوست تھے، اس لیے انگریزی میں مضامین دینے والے دوستوں کا شکریہ تو پہلے ادا کر چکا اور اردو کا ایک دوسرا نسخہ جب مالک رام صاحب نے عطا فرمایا تو یہ معذرت نامہ لکھنے کا موقع نکلا، میں اس تاخیر کی معذرت چاہتا ہوں، اور دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

دار المصنفین کی طرف سے میں انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کے رکن کی حیثیت سے اس کے سالانہ جلسہ میں دہلی بارہ برس سے جایا کرتا ہوں، اس سال اس کا جلسہ ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو طے پایا، میں نے حسب معمول اس میں شرکت کا ارادہ کیا تو خیال ہوا کہ اس مرتبہ ذاکر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا، ۲۱ اپریل ۶۹ء کے ایک خط میں ان سے ملنے کی تاریخ کا طالب ہوا، وہ ان ہی دنوں آسام کے دورہ پر جانے والے تھے، اسلیے اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ ٹیلیفون سے دریافت کر لوں گا کہ کون سی تاریخ اور وقت میں حاضر خدمت ہونا ہے، ۳۰ اپریل کو دہلی پہنچا، اور

مجھی پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے یہاں ٹھہرا، ۳ مئی کو دس بجے خانۂ ایران میں ایران کے کلچرل کونسلر جناب ہاشم کردوش سے ایک ملاقات طے تھی، ان سے ملنے کے بعد تقریباً پونے گیارہ بجے وہیں سے راشٹرپتی بھون ٹیلیفون کیا کہ مجھ کو کس روز اور کس وقت طلب کیا گیا ہے، سکریٹری نے بتایا کہ میرا خط فائل میں رکھا گیا ہے، اب وہ راشٹرپتی سے پوچھ کر مجھ کو تھوڑی دیر میں تاریخ اور وقت بتا دیں گے، میں نے ان سے کہا کہ وہ وقت اور تاریخ دریافت کر لیں، میں چار بجے ٹیلیفون سے دریافت کر لونگا، اس کے بعد میں اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔

انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کے جلسہ کے لیے آزاد بھون روانہ ہو رہا تھا کہ محبی ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اچانک یہ خبر سنائی کہ حرکت قلب کے بند ہو جانے سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا انتقال ہو گیا، ایسا معلوم ہوا کہ مجھ پر بجلی گر پڑی، دل و دماغ پر تاریکی چھا گئی، کسی طرح آزاد بھون پہنچ گیا جہاں اور بھی نمائندے آئے ہوئے تھے، سب ہی سوگوار تھے، جلسہ جناب صدر بی، ان کھوسلا اور جناب ہرینے ناتھ کنزرو کی تعزیتی تقریروں کے بعد ملتوی کر دیا گیا، دونوں نے ان کو سیکولرزم کا اعلیٰ نمائندہ بتایا، حیدرآباد سے اس جلسہ کے لیے ڈاکٹر عبد المعید خاں صدر شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی بھی آئے تھے، ان کو بھی ذاکر صاحب سے بڑا لگاؤ تھا، ہم دونوں ساڑھے پانچ بجے تک راشٹرپتی بھون پہنچ گئے، کسی نے خبر دی تھی کہ میت پانچ بجے اس کے دربار ہال میں لاکر رکھ دی جائے گی، وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سات بجے رکھی جائیگی، اندر باہر بڑا ہجوم تھا، وزرا اور سفرا، اور معززین تعزیت کے لیے برابر آرہے تھے، پھر اتنی بھیڑ ہوئی کہ ڈاکٹر عبد المعید خاں نے کہا کہ اب میت کو دیکھنا ممکن نہ ہو سکے گا، اس لیے ہم دونوں آخری دیدار سے محروم ہو کر واپس ہو گئے،

۴ مئی ۱۹۶۹ء کو میں جماعت اسلامی کے دفتر پہنچا، تو مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی کو بھی سوگوار پایا، وہ ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کے بڑے معترف تھے، وہاں سے راشٹرپتی بھون عبد العظیم صاحب ٹونکی کے ساتھ چلا گیا، میت کی زیارت کرنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، تقریباً ایک میل کی قطار لگی ہوئی تھی، بڑی مشکل سے دربار ہال پہنچا، میت گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی، دیکھ کر آنکھیں نمناک ہو گئیں کہ ہندوستان کا گل سرسبد، سیکولرزم کا گل لالہ، راشٹرپتی بھون کا بیر رعنا نہیں بلکہ مغل گارڈن کا گل رعنا آج ٹوکریوں پھولوں کے نیچے بے جان پڑا ہے، جہز کھلا تھا،

اسکی طرف نظر اٹھی، لیکن جھک گئی، حسن تشکیل اور وجیہہ چہرہ پر شروع میں مقصد حیات کی بلندی، قلندری کا بانکپن، محبت کی قوس قزح، اخلاص کی شفق، علم کی گہرائی اور آخر میں شاہانہ ماحول میں پُر از عظمت انکسار دیکھا تھا، اسکو بے حس و حرکت دیکھا نہیں گیا، انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز کانٹوں کے سیج پر لیٹ کر کیا تھا، دنیا ان کو پھولوں کی سیج پر سلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، لیکن اس وقت رونے والوں کی کمی نہ تھی، جو میرے آنسوؤں کی کوئی قیمت ہوتی، میت کے پاس قرآن خوانی ہو رہی تھی، میں بھی شریک ہو گیا، عصر کا وقت آیا تو ہال میں اذان دی گئی، نماز باجماعت ادا کی گئی، اس دربار ہال میں کبھی تکبیر کی آواز بلند نہیں ہوئی ہوگی، کلام پاک بھی نہ پڑھا گیا ہوگا، نماز کی برکت سے بھی متبرک نہ ہوا ہوگا، لیکن ذاکر صاحب کی بدولت یہ ہال کئی روز تک کلام الٰہی سے گونجتا رہا، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں نے بھی اپنے اپنے مذہبی گیت گائے، لاش کی نگرانی ذاکر صاحب کے بڑے داماد خورشید احمد صاحب کر رہے تھے، بے انتہا مغموم تھے، میں نے ان سے اظہار تعزیت کرنا چاہا، لیکن میری تعزیت کی کیا قدر ہو سکتی تھی، جب دنیا کے مشاہیر کے تعزیتی پیام انکے پاس پہنچ رہے تھے، پھر بھی بے اختیار ہو کر ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، مشکل سے ایک دو جملے کہہ پایا، وہاں سے لوٹا تو جماعت اسلامی کے اخبار دعوت کے اڈیٹوریل پر نظر پڑی، جس کے کچھ ٹکڑے یہ تھے:۔

"ذاکر صاحب کے افکار سے بہت سے لوگوں کو اختلاف رہا ہوگا، یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں، لیکن انکی مرنجاں مرنج طبیعت، انکی ملنساری اور تواضع، انکا علمی وقار اور تہذیبی انکسار، تعمیری کاموں سے انکی لگن، جس چیز کو صحیح سمجھا اس کے لیے ایثار اور قربانی کی راہ اپنانا، مرحوم کی یہ خوبیاں تھیں جنھیں انکے بعد بھی یاد رکھا جائیگا ....

ابھی آپ ناگالینڈ اور آسام گئے ہوئے تھے، اس موقع پر گوہاٹی میں اپنے ایک شاگرد حسنین سید سے ملاقات کے موقع پر جو بات چیت کی وہ آپ کی دین پسندی کے رجحان کی شاہد ہے، حسنین سید صاحب نے ملاقات کے موقع پر آپ سے شکایتاً کہا کہ آج جمعہ کا دن ہے، یہ صحیح ہے کہ مسافر پر جمعہ واجب نہیں ہے، پھر بھی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کا پروگرام آپ بنا لیتے تو لوگوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا، اپنے شاگرد کی یہ شکایت سنکر جواب دیا، افسوس کیا بتاؤں

میرے دونوں گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے، تحیات و درود پڑھنے کے لیے جس طرح بیٹھا جاتا ہے، میں نہیں بیٹھ سکتا، اپنی قیامگاہ پر چوکی پر بیٹھ کر پاؤں ٹکا کر نماز پڑھ لیتا ہوں، مسجد میں یہ صورت نہیں ہو سکتی، سال میں عیدین کے موقع پر جب عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتا ہوں تو بڑی تکلیف سے نماز ادا کرتا ہوں"۔ (روزنامہ دعوت، مورخہ ۹ مئی ۱۹۶۹ء)

ذاکر صاحب کے بہار کی گورنری کے زمانہ کے ایک سکریٹری کا بھی ایک تعزیتی بیان شائع ہوا کہ وہ جب تک وہاں گورنر کے عہدہ پر فائز رہے، پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرنے کے عادی رہے،

انکی وفات پر بے شمار بیانات نکلے، تمام اخباروں نے اڈیٹوریل لکھے، مضامین شائع کیے، بڑے بڑے جلسے ہوئے، مؤثر اور دلگداز تقریریں ہوئیں، لیکن اوپر صرف ایک اداریہ اور ایک بیان کا ذکر اسلیے کیا گیا ہے کہ دنیا میں تو ان کو ہر قسم کا اعزاز ملا، سفر آخرت کے لیے بھی انکو زادِ راہ چاہیے تھا، جس سے وہ غالباً خالی نہیں گئے۔

۵ مئی کو پانچ بجے سہ پہر کو راشٹرپتی بھون میں جنازہ کی نماز کا اعلان ہوا، بڑا ہجوم تھا، فوجوں کا زبردست پہرہ تھا، میں بھی مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی اور ان کے ہمراہیوں کے ساتھ بڑی مشکل سے راشٹرپتی بھون پہنچا، جسکا میدان سواروں، فوجیوں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے نمائندوں اور حکومت کے وزیروں اور عہدیداروں سے بھرا پڑا تھا، اس سرکاری تقریب میں کلمہ طیبہ کی آواز بھی فضا میں گونج رہی تھی، دربار ہال سے جنازہ باہر آیا، سرکاری قاعدہ کے مطابق اکیس توپوں کی گونج میں سواروں نے سلامی دی، جنازہ کی نماز دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب نے پڑھائی، اور جب جنازہ سرکاری اعزاز کے ساتھ بحری، بری اور ہوائی فوج کے جلو میں روانہ ہوا تو فضا یہ کہہ رہی تھی کہ یہ صرف صدر جمہوریۂ ہند کا جنازہ نہیں، بلکہ صحیح معنوں میں انسانی قدروں کی معرفت حاصل کرنے والے، مشرق و مغرب کی خوبیوں کو اپنے میں سمونے والے، اسلامیت اور قومیت کے حسین امتزاج کا خواب دیکھنے والے، ہندو مسلم کا اتحاد دل سے چاہنے والے، رواداری، فراخدلی اور یکجہتی کے لیے قلب و جگر میں تڑپ رکھنے والے، شرافت، اخلاق کو اپنی وضعداری اور شائستگی سے جلا دینے والے، لینت، محبت اور اخلاص میں نکھار پیدا کرنے والے کا بھی جنازہ ہے،

۶ مئی ۱۹۶۹ء کی شام کو مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی کے ساتھ جامعہ نگر جا کر انکے مرقد پر حاضری دی،

وہاں جامعہ ملیہ کے بہت سے لوگ موجود تھے، ان میں سب سے زیادہ مغموم ڈاکٹر عابد حسین صاحب تھے، جو ذاکر صاحب کے بہت ہی قدیم دوست اور ساتھی ہیں، انھوں نے جامعہ ملیہ کے پرانے دور کی تنگی اور عسرت کے کچھ واقعات سنائے، اور جب میں قبر کے پاس کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھنے لگا تو دل کہہ رہا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہے ان میں درشاہوار کی آب و تاب رہی، بلکہ وہ کوہ نور بنکر چمکے، وہ تہذیب و ثقافت کے ایک شاندار باب بھی تھے، بہت سی حسین اداؤں کے ایک گلدستہ بھی، زندگی کی رعنائیوں کے ایک چمن بھی لیکن آہ اب مٹی کے تودے کے نیچے ابدی نیند سو رہے ہیں، انکی زندگی کی الف لیلیٰ تو ختم ہو گئی لیکن وہ اپنے پیچھے اپنی یادوں کی ایک انجمن چھوڑ گئے ہیں جس میں معلوم نہیں انکی کتنی نیکیوں اور خوبیوں کی شمع بار بار فروزاں رہیگی، انھوں نے اپنی زندگی میں جامعہ ملیہ میں اسلامی اور قومی قدروں کے نور کے جوت جگائے تھے، امید ہو کہ ان کی زندگی کے بعد بھی ان کا مرقد جامعہ ملیہ کے لیے روشنی کا مینارہ بنا رہے گا، اسی کے پاس ان کے ایک اور پرانے ساتھی ارشاد حسین صاحب سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ نے بتایا کہ انھوں نے آخر زمانہ میں کلام پاک بھی حفظ کرنا شروع کر دیا تھا، یہ سنکر خوشی ہوئی کہ ان کے سفر آخرت کے زاد راہ کا بھی شاید یہ بڑا انتظام ہے،

۸ مئی کی صبح کو جناب سید حسین صاحب ایم اے علیگ کے ساتھ ذاکر صاحب کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب سے ملا، جو اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین کی تیمارداری کے لیے ولنگڈن اسپتال میں تھے، موخرالذکر کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اپنے محبوب بھائی اور فخر خاندان کے جنازہ میں شرکت کے لیے دہلی آئے تو میت دیکھکر ایسے بے قرار ہوئے کہ ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے، یہ تحریر لکھتے وقت خدا کے فضل و کرم سے بہتر ہیں، ڈاکٹر یوسف حسین کے دل میں اپنے مرحوم بھائی کی جو عزت و محبت تھی، اس کا اندازہ انکی حسب ذیل تحریروں سے ہوگا جو ذاکر صاحب کی زندگی ہی میں ان کی دلچسپ تصنیف "یادوں کی دنیا" میں لکھی گئیں:

"جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہو وہ انکے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیز سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے، میں سمجھتا ہوں یہ ان کے اخلاص و عقیدت اور بے تصنع زندگی کا تقاضا ہے

.... ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ آئینہ کی طرح پاک صاف رہی ہے، اس میں ہر بات ظاہر ہے، کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں، جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، انکی سیرت کے اوصاف پبلک زندگی اور نجی زندگی دونوں ہی میں یکساں ہیں، وہی سادگی، وہی بے ساختگی، وہی نمائش سے گریز، وہی ملنساری، وہی محبت کا نبھاؤ، وہی وضعداری اپنوں سے بھی اور پرایوں سے بھی، وہ ایک شفیق باپ، ایک دردمند بھائی، ایک مخلص دوست ہیں، ہر حالت میں آدمی ان پر بھروسہ کر سکتا ہے .... انھوں نے جس طرح فقر میں شاہی کی، بلند نگاہی نہیں چھوڑی، اسی طرح شاہی میں فقر کے آداب کا احترام کرتے ہیں، جہاں بھی رہے مقبول اور محبوب رہے، جو ان سے ایک مرتبہ مل گیا، انکی دلنواز شخصیت سے مسحور ہو گیا .... بلاشبہ ذاکر بھائی فخر خاندان تو ہیں ہی لیکن اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہیں، ان کی شخصیت کی حدود خاندان کے باہر بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں، ان کی روح کی روشنی سے بہت سارے دل اور بہت سی محفلیں منور ہیں، اگر انھیں فخر قوم کہا جائے تو یہ زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا، وہ اپنی ذات سے انجمن ہیں، اور بہت سی انجمنیں ان کی ذات سے فیضان حاصل کر رہی ہیں، ہمیں اس بات پر بجا طور فخر ہے کہ یہ چراغ جس سے بہت سی انجمنیں روشن ہیں، ہمارے گھر کا چراغ ہے، بقول شاعر

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند"

۹ مئی کو دارالمصنفین واپس آیا تو جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ یہاں کے ہر فرد کو سوگوار اور مغموم پایا، اس لیے کہ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے نہ صرف بہت ہی قدیم رکن تھے، بلکہ اس کے بہت بڑے محسن بھی تھے، یہ تحریر ختم کرتے وقت دل سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ بار الہا! ان کو اپنی آغوش رحمت میں لینا، تیری بنائی ہوئی دنیا میں عاجز بندوں ہی سے نہیں بلکہ بڑے بڑے حکمرانوں، رہنماؤں اور مصلحوں سے بھی خطائیں ہوتی رہی ہیں، لیکن تیری ستاری اور غفاری میں کمی نہیں ہوتی، تجھ کو بعض

اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں پسند ہو جاتی ہیں، ان ہی سے تیری رحیمی اور کریمی حرکت میں آجاتی ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ بزرگوں نے سلطان محمود غزنوی کو اس کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا، پوچھا اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا، جواب دیا، ایک رات میں کسی قصبہ میں مہمان تھا، جس مکان میں ٹھہرا تھا وہاں طاق میں قرآن شریف کا ایک ورق رکھا ہوا تھا، میں نے خیال کیا، یہاں ورق مصحف رکھا ہوا ہے، سونا نہ چاہیے، پھر دل میں خیال آیا کہ ورق مصحف کو کہیں اور رکھوا دوں، اور خود یہاں آرام کروں، پھر سوچا کہ بڑی بے ادبی ہوگی اگر اپنے آرام کی خاطر ورق مقدس کی جگہ تبدیل کردوں، اس ورق کو دوسری جگہ نہ بھیجا، تمام رات جاگتا رہا، میں نے کلام پاک کے ساتھ جو ادب کیا، اسی کے بدلے حق تعالیٰ نے مجھکو بخش دیا۔ (دلیل العارفین مجلس پنجم)۔ ہندوستان کے غلام خاندان کا حکمران شمس الدین التمش بڑا دیندار بادشاہ گذرا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی روایت ہے کہ لوگوں نے اس کی وفات کے بعد اس کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ خداوند تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا کیا، تو اس نے جواب دیا کہ میری بخشش اس حوض کی بدولت ہوئی جو میں نے دہلی میں لوگوں کو شیریں پانی فراہم کرنے کے لیے کھدوایا۔ (فوائد الفواد، ص ۱۱۹)۔ بار الٰہا! ذاکر صاحب سے ضرور بشری لغزشیں ہوئیں، ممکن ہے کہ ان سے تیرے احکام کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو، لیکن تیرے بندوں کی نگاہوں میں ان میں بہت سی نیکیاں، خوبیاں اور اچھائیاں بھی تھیں، اے بندوں کی خطاؤں اور لغزشوں کو درگذر کرنے والے آقا! تو بڑا ہی غفور الرحیم ہے دعا ہے کہ ان کی بھی کوئی ادا، اور کوئی بات تیری بارگاہ میں قبول ہو گئی ہو، اور وہ تیری رحمتوں کی کوثر، برکتوں کی تسنیم اور شان کریمی کی سلسبیل سے سیراب ہو رہے ہوں۔ آمین ثم آمین۔

مطبوعات جدیدہ

صحیفہ غالب نمبر:۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی و کلب علی خاں فائق صاحبان، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ صفحات ۵۰۰ مع عمدہ سرورق، قیمت عہ، پتہ مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ، لاہور۔

غالب کی صد سالہ یادگار میں پاکستان کے رسالوں نے بھی خاص نمبر نکالے ہیں، ان میں "مجلس ترقی ادب لاہور" کے مشہور علمی و ادبی رسالے "صحیفہ" کا غالب نمبر بہت ممتاز اور غالب کے عہد، ان کی شخصیت و سوانح اور فنی کمالات کے متعلق محققانہ اور معلومات افزا مضامین کا اچھا مجموعہ ہے، "آبحیات" کے اصل مسودہ میں مولانا محمد حسین آزاد نے جو اضافہ و ترمیم اور اصلاح کی تھی اور جو ابھی تک شائع نہیں ہوا تھا، ان کے نبیرہ آغا محمد باقر نے اس کا وہ حصہ جو غالب کے متعلق ہے۔ اس نمبر میں مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ غالب کے مخصوص ادبی نظریات کے سلسلہ میں "مختصات نثر غالب" (نجم الاسلام) اور "غالب اور ذال معجم" (سید قدرت نقوی) محققانہ مضامین ہیں، آخر الذکر میں ذال معجم کے متعلق غالب اور ان کے مخالفین کے نقطۂ نظر کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے، اور اس کا منصفانہ محاکمہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر عندلیب شادانی نے دکھایا ہے کہ غالب "آئین اکبری" کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، لیکن خود ان کی تصنیف "پنج آہنگ" میں اس کے اثرات موجود ہیں، غالب کی فارسی اور اردو شاعری کے متعلق محمد منور، ڈاکٹر وزیر آغا اور نظیر صدیقی کے مضامین قابل ذکر ہیں، اکبر خاں کے مضمون "بسلسلۂ غالب" سے بعض مفید اور

نئے معلومات حاصل ہوتے ہیں، چند مضامین میں غالب کے عہد، خطوط نگاری کی خصوصیات، تاریخ گوئی میں ان کے مرتبہ اور اس زمانہ کی صحافت کا ذکر ہے، مرتضیٰ حسین نے منشی نولکشور سے غالب کی ملاقات اور تعلقات کی سرگذشت بیان کی ہے، اور اودھ اخبار کی تحریروں کی روشنی میں ان کی بعض غزلوں، خطوط اور کتابوں کی تاریخ اشاعت کی تعیین کی ہے، گو اس نمبر کے بعض مضامین فروغ اردو کے نمبر میں جو پہلے شائع ہوا تھا، آچکے ہیں۔ تاہم اس سے اس کی قدر وقیمت میں فرق نہیں آتا۔ اور غالب کے متعلق یہ مفید مواد و معلومات کا اچھا مجموعہ ہے اور بیشتر مضامین محققانہ، پُرمغز اور سنجیدہ ہیں، ان سطروں کے لکھے جانے کے بعد دوسرا حصہ بھی جو سوا سو صفحات پر مشتمل ہے، موصول ہوگیا، اس میں بھی غالب کی شاعری اور شخصیت کے بعض پہلوؤں پر کئی مفید اور دلکش مضامین ہیں، ابن فرید، افتخار جالب، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے مضامین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس حصہ کی قیمت دو روپئے ۲۵ پیسہ ہے، اس کا تیسرا حصہ جولائی میں شائع ہوگا۔

اردو غالب نمبر:- مرتبہ جمیل الدین عالی و شفق خواجہ صاحبان، متوسط تقطیع، کاغذ معیاری، طباعت ٹائپ، صفحات ۲ ۴ ۵، قیمت ۶ پتہ: انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ، کراچی۔

غالب نمبروں کے انبار میں جو دو چار ممتاز اور اہم نمبر شائع ہوئے ہیں، ان میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی مجلہ "اردو" کا یہ خاص نمبر بھی ہے، اس میں غالب کی شخصیت، ماحول، فکر و فن، شاعری، خطوط، تصنیفات اور تلامذہ وغیرہ کے متعلق محققانہ اور بلند پایہ مضامین ہیں، جن سے غالب کے بارہ میں بعض اہم اور نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک مضمون میں غالب کی صحیح تاریخ پیدائش کی تعیین کی گئی ہے، ایک مضمون میں غالب کے چند ایسے تلامذہ کا ذکر ہے جو صاحب تلامذۂ غالب مالک رام صاحب کی نظر سے رہ گئے ہیں، یا جن کو انھوں نے غلطی سے تلامذہ کے زمرہ میں شامل کرلیا ہے، اور وہ واقعی

ان کے تلامذہ نہیں ہیں، نادم سیتاپوری نے غالب کی جانب منسوب آبحیات وغیرہ کی بعض روایتوں کی تحقیق کی ہے اور ان کو غلط ثابت کیا ہے، جلیل قدوائی نے اسی کے مرتبہ غالب کے کلام میں الحاق کی دلچسپ داستان بیان کی ہے، امتیاز علی خاں عرشی نے سبد باغ دو در کو اس نمبر میں شائع کیا ہے، اور اس کو غالب کی آخری تصنیف قرار دیا ہے، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہ نے بعض غیر مطبوعہ تذکروں سے غالب اور ان کے تلامذہ کے متعلق معلومات فراہم کئے ہیں، ڈاکٹر عبدالغنی نے غالب کی ایک غیر معروف شرح "بوستان خرد" کا تعارف کرایا ہے، غلام رسول مہر صاحب نے ان کے بعض ہم معنی اردو، فارسی اشعار کی نشاندہی کی ہے، ان کے علاوہ غالب کے ماحول، اجتماعی شعور، فارسی نظم و نثر اور شاعرانہ عظمت کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اہل قلم کے مضامین ہیں، غرض اس نمبر کے اکثر مضامین پُر از معلومات ہیں، اور یہ غالبیات کے ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ ہے،

غالب اور ابو الکلام:- مرتبہ جناب محمد عتیق صدیقی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۸ مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو غالب اور انکی شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، انھوں نے انکے بعض غیر مطبوعہ قصائد و غزلیات کو ایک قلمی دیوان کی مدد سے الہلال و البلاغ کی کئی قسطوں میں شائع کیا تھا، اور اسکی تمہید میں انکی زندگی اور شاعری کے بارہ میں ایک مقالہ بھی لکھا تھا، یہ مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ اس وقت تک غالب پر بہت کم لکھا گیا تھا، اسکے باوجود ابھی تک دوبارہ شائع نہیں ہوا تھا، اب جشن غالب کے سلسلہ میں اس قند مکرر کو پہلی بار شائع کرنے کی سعادت مولانا کے ایک عقیدت کیش اور اردو کے شگفتہ نگار اہل قلم محمد عتیق صدیقی صاحب کے حصہ میں آئی ہے، زیر نظر کتاب کے پہلے حصہ میں مولانا کا مقالہ اور الہلال و البلاغ میں شائع شدہ غیر مطبوعہ کلام ہے، دوسرا حصہ ان حواشی پر مشتمل ہے جو غلام رسول مہر صاحب کی کتاب "غالب" میں اضافہ

کے یہ مولانا نے تحریر فرمائے تھے، اور اسکے دوسرے اڈیشن میں چھپ بھی چکے ہیں، آخر میں غالب کے ان اردو وفارسی اشعار کو جمع کیا گیا ہے جو مولانا نے اپنی تحریروں میں استعمال کیے ہیں، دونوں حصے فاضل مرتب کے مفید توضیحی حواشی سے مزین ہیں، مولانا نے مہر صاحب کی کتاب پر بے اطمینانی کے زمانہ میں نوٹ لکھے تھے، اس لیے وہ بلا ترتیب تھے اور ان میں بعض فروگذاشتیں بھی رہ گئی تھیں، فاضل مرتب نے ان کو مرتب کر کے انکی تصحیح بھی کر دی ہے، کتاب کے مقدمہ میں مولانا کی غالب سے دلچسپی اور دونوں کی مشترک خصوصیات کا دلچسپ انداز میں ذکر ہے، کتاب بڑی خوش مذاقی اور سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے، اس کی اشاعت سے ایک اہم یادگار تحریر محفوظ ہو گئی اور غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا،

پیام تعلیم ذاکر نمبر:۔ مرتبہ مولوی محمد حسین حسان صاحب ندوی، اوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۰ قیمت ۶۰ پیسے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کا جامعہ میں ہمیشہ سے خاص اہتمام رہا ہے، اس مقصد کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی تحریک سے "پیام تعلیم" جاری کیا گیا تھا، اس میں وہ خود بھی کبھی کبھی لکھتے رہتے تھے، اس لیے یہ رسالہ درحقیقت ان ہی کی یادگار ہے، ان کی وفات کے بعد اس نے خاص نمبر نکالا ہے، یہ نمبر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے متعلق مختلف النوع آسان اور عام فہم مضامین اور نظموں کا بہت مفید مجموعہ ہے، اور اس سے بچوں سے دلچسپی، ان کے قومی و ملی خدمات، انکے تعلیمی کارنامول ان کی زندگی اور دلآویز شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں، بیشتر مضمون نگار ڈاکٹر صاحب سے قریبی تعلق رکھنے والے ہیں، اس لیے ان کے مضامین میں ڈاکٹر صاحب کی صحیح تصویر بھی ہے اور تاثیر بھی، ان کی زندگی ہر عمر کے لوگوں کے لیے سبق آموز تھی، اس لیے یہ نمبر بھی سب کے لیے سبق آموز ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۴ - ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۹ء - عدد ۲

مضامین